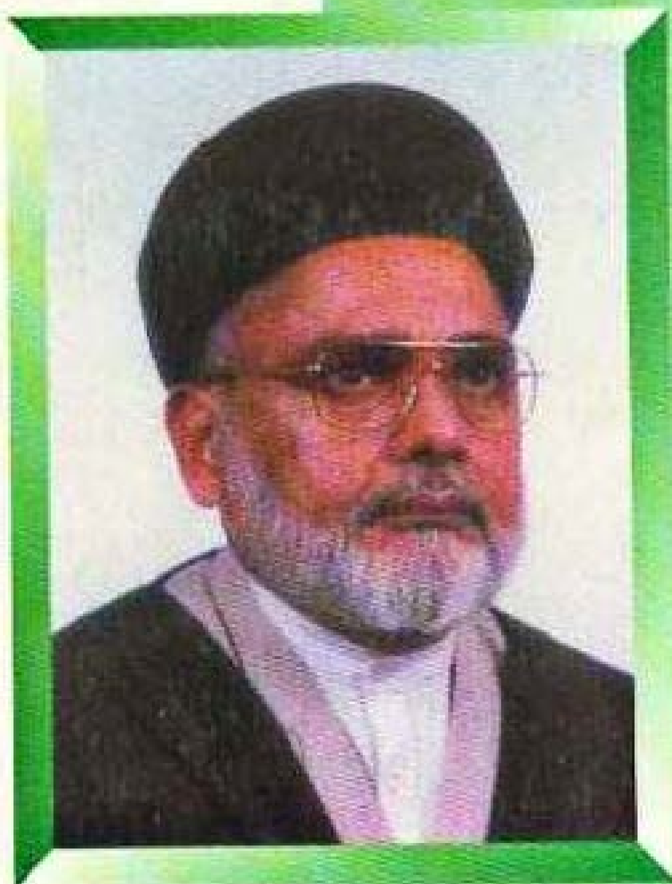
فدک



علامہ السید ذیشان حیدر جوادی طاب ثراہ

مولائے کائنات

ابوالائمہ حضرت امام علی ابن ابی طالب علیہ السلام

کی مناجاتوں میں سے ایک مناجات

اِلٰهِي كَفٰى بِيْ عِزًّا اَنْ اَكُوْنَ لَكَ عَبْدًا وَكَفٰى
بِيْ فَخْرًا اَنْ تَكُوْنَ لِيْ رَبًّا اَنْتَ كَمَا اُحِبُّ
فَاجْعَلْنِيْ كَمَا تُحِبُّ

میرے اللہ میری عزت کے لئے یہی کافی ہے کہ میں تیرا بندہ ہوں اور میرے فخر کے لئے یہی کافی ہے کہ تو میرا پروردگار ہے۔ تو ویسا ہی ہے جیسا میں چاہتا ہوں، پس تو مجھ کو ویسا بنا لے جیسا تو چاہتا ہے۔

اشتراک:



IDAARA-E-TARVEEJ-E-SOAZKHWANI

ادارۂ ترویجِ سوز خوانی

Post Box No. 10979, Karachi-74700



فدک

تاریخ کی روشنی میں

علامہ السید ذیشان حیدر جوادی اعلی اللہ مقامہ



ادارہ نشر و حفظ افکار علامہ جوادیؒ

نام کتاب	:	فدک تاریخ کی روشنی میں
مؤلف	:	علامہ سید ذیشان حیدر جوادی طاب ثراہ
ناشر	:	عصمہ پبلیکیشنز کراچی
تعداد اشاعت	:	۵۰۰
تاریخ اشاعت	:	اگست ۲۰۰۲ء
طباعت	:	عاصم پرنٹنگ ناظم آباد نمبر ۲ کراچی
سیریل ایڈیشن	:	پہلا ایڈیشن
ہدیہ	:	۶۰/- روپیہ
مشیر قانون	:	پروفیسر سید سبط جعفر زیدی ایڈوکیٹ جناب شبر رضوی ایڈوکیٹ (ہائی کورٹ)
سرورق (ٹائٹل ڈیزائننگ)	:	سید امتیاز عباس

اسٹاکسٹ

افتخار بک ڈپو۔ اسلام پورہ کرشن نگر۔ لاہور

مکتبۃ الرضا۔ ۸ بیسمنٹ میاں مارکیٹ۔ اردو بازار۔ لاہور

رحمت اللہ بک ایجنسی کھارادر۔ کراچی

حسن علی بک ڈپو۔ کھارادر۔ کراچی

محفوظ بک ایجنسی۔ مارٹن روڈ۔ کراچی

عباس بک ایجنسی۔ رستم نگر۔ لکھنؤ

خراسان بک سینٹر بریٹو روڈ۔ کراچی

احمد بک ڈپو۔ رضویہ سوسائٹی کراچی

زیدی بک اسٹال۔ خراسان کراچی

سید محمد ثقلین کاظمی جی 6/2۔ اسلام آباد

محمد علی بک ڈپو دھمیال کیمپ۔ راولپنڈی

سوے بکس لائبریری اینڈ اسٹیشنرز۔ سکردو۔ بلتستان

مکتبہ علویہ مرکز تبرکات و تحائف رضویہ سوسائٹی کراچی

S. Jawad Haider Rizvi
Principal
JAMIA IMAMIA ANWARUL ULOOM
39, Mirza Ghalib Road, Allahabad - 211 003 • Ph.
Residence : D-19, Kareli Colony, Allahabad - 211 016 • Ph.

سید جواد حیدر رضوی
مدیر جامعہ امامیہ انوار العلوم
۳۹۔ مرزا غالب روڈ۔ الٰہ آباد۔

اجازت نامہ

جناب محترم سید ایوب نقوی صاحب

مدیر عصمہ پبلیکیشنز کراچی پاکستان

سلام علیکم

امید ہے کہ بفضلہ تعالیٰ بخیریت ہوں گے۔

والدالعلام سرکار علامہ سید ذیشان حیدر جوادی طاب ثراہ سے انکی تصنیفات و تالیفات کو شائع کرنے کیلئے سید اسیر کفر عباس صاحب قبلہ کی موجودگی میں انکی حیات میں گفتگو ہوئی تھی اس گفتگو کے پس منظر میں آپ کو اجازت دی جاتی ہے کہ والد مرحوم طاب ثراہ کی جملہ تصنیفات و تالیفات کو پاکستان میں شائع کر سکتے ہیں یہ اجازت آپ کے ادارہ عصمہ پبلیکیشنز کیلئے مخصوص و محدود ہے۔

جناب ایوب نقوی صاحب کے علاوہ کوئی دوسرا شخص انفرادی طور پر یا کوئی ادارہ آپ کی اجازت کے بغیر والدالعلام سرکار علامہ سید ذیشان حیدر جوادی طاب ثراہ کی تصنیفات و تالیفات کو شائع نہیں کر سکتا۔ اگر کوئی صاحب یا ادارہ اسکی خلاف ورزی کرتا ہے تو وہ خود اسکا مسئول ہوگا اور جناب ایوب نقوی صاحب کو قانونی چارہ جوئی کرنے کا مکمل حق حاصل ہوگا۔

والسلام علیٰ من اتبع الہدیٰ

سید جواد حیدر رضوی
ابن علامہ سید ذیشان حیدر جوادی طاب ثراہ
۲۳ ستمبر ۲۰۰۰ء

پیش لفظ

عزیزانِ گرامی۔ ایک عرصے سے دل میں یہ تمنّا تھی کہ کوئی ایسی کتاب عالم اسلامی کے سامنے پیش کی جائے کہ جو اپنے موضوع میں فی الجملہ ندرت اور مضامین میں ایک گونہ جدت رکھتی ہو۔ اس سلسلے میں میں نے ایک کتاب نظام اسلام کے نام سے تالیف بھی کی لیکن ابھی اس کے اوراق ناتمام و غیر مرتب ہی تھے کہ خوبیٔ قسمت نے آیۃ اللہ حجۃ الاسلام فیلسوف الشرق السید محمد باقر الصدر سے شرف تلمذ حاصل کرنے کا موقع دیا۔ استاد محترم کی ذات ان حضرات کے لیے قطعاً قابلِ تعارف نہیں ہے جو حوزۂ علمیہ نجف اشرف کے افاضل سے واقفیت رکھتے ہیں یا جو عصرِ حاضر کی علمی کتب کا برابر مطالعہ کرتے رہتے ہیں۔ استاد علام کی ایک کتاب بنام "فلسفتنا" منظرِ شہود پر آچکی ہے خیال یہ تھا کہ اس کا ترجمہ پیش کرنا۔ لیکن کتاب کی ضخامت اور مضامین کی دقّت اس کی عام افادیت سے مانع تھی اس لیے اس کتاب "فدک" کا ترجمہ نذرِ حاضرین کرنا پڑا۔ اس کتاب کے ترجمہ کا سبب یہ ہوا کہ ہمارے برادرِ محترم جناب السید غلام سبطین صاحب ایم۔کام نے بڑی شدت کے ساتھ اصرار کیا کہ کتاب کی افادیت کو عام ہونا چاہیے۔ اس کے علاوہ انھوں نے یہ بھی فرمایا کہ اس کتاب کو مدرسہ امجدیہ کراچی کی طرف سے شائع کیا جائے جس سے مدرسہ کے خدمات کا بھی اظہار ہو سکے اور اس کے لیے کچھ اقتصادی فوائد بھی حاصل ہو سکیں بنا بریں میں نے نہایت قلیل مدت میں اس ترجمہ کو ختم کر دیا۔ اہلِ ادب و عربیت سے گذارش ہے کہ وہ سامحات و اشتباہات پر زیادہ توجہ نہ فرمائیں گے۔ اس لیے کہ ترجمہ بطور تلخیص کلام پیش کیا گیا ہے

خداوند عالم سے بھی التجا ہے کہ اس حقیر ہدیہ کو قبول فرمائے اور اس خدمت پر مؤلف محترم کو اجر جزیل عطا فرمائے اور مومنین کرام کو اس کے صحیح مطالعہ کی توفیق دے۔

والسلام علیٰ من اتبع الھدیٰ

السید ذیشان حیدر رضوی
الکراروی

فہرست مضامین

۱۔ انقلابی مناظر

انقلاب کی مہم تحسین زہرا میں
حالات کی تلخی اور شعور کی پختگی
انقلابی ملاحظین ایک محور اس ماہ
راہ انقلاب
فاطمی مظاہرے کے شرکاء
ایک منظر اور اس کا پس منظر
ایک کلمہ آمال و آلام انقلاب سے متعلق

۲۔ فدک

فدک تاریخ اسلامی کے ابتدائی دور میں۔
فدک عہد امیر المومنین میں۔
فدک اور حکومتوں کی عالمی سیاست
فدک کی مادی اہمیت اور اس کے دلائل۔

۳۔ تاریخ انقلاب

تاریخی بحث کے قوانین و قواعد
صدر اسلام کی حکمت اور جواز تنقید
عقاد کی کتاب "فاطمہ و فاطمیین" اور ہم
طرفین کے موقف کی احساسی تعلیل
انقلاب کا سیاسی رنگ
حکومت میں جماعتی رنگ آمیزی
حزب حاکم کی رقابت آل محمد کے ساتھ
فدک میں موقف خلیفہ اور طرز مخالفت آل محمد
امام کا حزب حاکم سے عظیم مقابلہ
امام کا سکوت اور احادیث سے احتجاج نہ کرنے کے اسباب:

مطالبہ فدک سیاست علوی کا اعلیٰ ترین کارنامہ ہے۔
فاطمی مقابلے کے مناظر
فاطمہ کی ناکامی اور کامیابی

۴۔ اقتباسات

عظمت پیغمبر روحانی منازل میں
فاطمی موازنہ امام و اخلیفہ کے درمیان
شجاعت، اخلاص اور قربانی کے معیار پر۔
اعلان فاطمی بر سیاست وقت کے متعلق
تعریف صدیقہ خلافت ابوبکر اور فتنہ کبریٰ کے متعلق

۵۔ مقدمہ فدک

خلیفہ اپنی قوم میں
جاری بحث اور موقف خلیفہ
معاملت خلیفہ اور ہماری تنقید
خلیفہ کیا چاہتے ہے؟
خلیفہ سے تعنیہ جلب
خلیفہ کی جرح دوسرے مرکز پر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۱۔ انقلابی مناظر

انقلاب کی مہم نفسِ زہراؑ میں

ایک مخدرہ اس عالم میں کھڑی ہوئی ہے کہ اس کو حالات کا پورا یقین ہے اور سختی موقف اس کے پیمانۂ صبر کو معمولی خوف و دہشت سے چھلکا نہیں سکتی۔ اور اس کے حقیقی خیالات میں کسی قسم کا تردد پیدا نہیں ہو سکتا۔ اور قلق و اضطراب کے افکار اس کے راہ انقلاب میں حائل نہیں ہو سکتے۔ اس لیے کہ یہ مخدرہ استعداد کامل اور ثبات قدم کی اس بلندی پر ہے جو اس کو ہر سخت اقدام اور دفاعی اسلوب پر جرأت دلا رہی ہے مخدرہ نے اس راستہ کو اختیار کیا ہے جس پر چلنا ایک عورت کے لیے انتہائی دشوار ہے۔ اس لیے کہ عورت کی طبیعت ضعیف ہوتی ہے اور موقف انتہائی شدائد و مصائب کا حامل ہے جو ایک ادبی جرأت اور بیانی ملکہ کا طالب ہے۔ اور ایک ایسی عورت چاہیے جس سے انقلابی مفاہیم الفاظ میں ڈھال دیے جائیں اور حالاتِ حاضرہ کی ایسی تنقید کی جائے کہ جس میں حیات کے مفاہیم اور دوام کے خطوط نمایاں ہو جائیں تاکہ ہر حرف ایک مستقل سیاہی اور ہر کلمہ تاریخ عقیدہ کی صحیح سند بن جائے لیکن ان تمام امور کے باوجود ایمان اور راہِ حق میں اقدامات کا جذبہ عورت کے کمزور نفس میں

طبیعت کے خلاف قوتیں پیدا کر رہا ہے۔ اور سمت طبیعت میں ایسی طاقت ایجاد کر رہا ہے کہ جس کو کوئی ضعف و تردد روک نہیں سکتا۔

اسی لیے مخدرہ نے اس راستہ کو اختیار کیا جو اس کی طبیعت کے موافق اور حق کی اعانت و نصرت پر کمربستہ شخصیت کے مناسب ہو۔ اس مخدرہ کے ساتھ اس کے اقربا اور قوم کی کچھ عورتیں اور بھی تھیں۔ جس طرح بکھرے ہوئے ستارے کہ ان کو یکجا کرنے والا کوئی نہ تھا۔ لیکن سب اس جذبہ دفاع اور انتقام میں برابر تھیں۔ اس جماعت کی قائدہ وہ تمام کلمات اپنے ذہن میں لا رہی ہے کہ جنھیں عدالت میں پیش کرنا ہے۔ اور وہ یہ تصور قوت قلب و سکون دل میں برابر اضافہ کر رہا ہے حق کی طاقت اس کے دل میں بڑھتی جا رہی ہے اور ارادوں کی پختگی اور چھنے ہوئے حقوق سے دفاع کے جذبات اور سختی موقف سے مقابلہ کے لیے عزائم میں زیادتی پیدا ہوتی جا رہی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس عورت نے اس سخت وقت میں اپنے مرد کا دل عاریتہً لے لیا ہے تاکہ ان سخت حالات کا مقابلہ کرے اور ان سخت مصائب کا سامنا کرے کہ جن سے پہاڑ ٹکڑے ہو جائیں اور سخت چٹانوں میں زلزلہ پیدا ہو جائے۔

اس ہولناک موقف میں یہ مجاہدہ مخدرہ اس شان سے کھڑی ہے کہ حزن و اندوہ کے بادل اس کے سر پر سایہ فگن ہیں۔ اس کے جسم اطہر کا رنگ متغیر چہرہ پر غضب کے آثار نمودار، دل محزون، قلب بے چین، جسم نڈھال، اعضاء و جوارح ضعیف ہو چکے ہیں۔ لیکن نفس مطہر میں گہرے افکار کی درخشندگی اور اطمینانِ قلب کی زیادتی ہے۔ یہ تمام باتیں اس لیے نہیں ہیں کہ اس مخدرہ کو کسی نام کی امید ہے یا کسی

اچھے نتیجے کی توقع ہے۔ بلکہ یہ نورانیت تو اپنے افکار کی پسندیدگی اور انقلاب کی مسرت سے ہے۔ اور یہ اطمینان اپنے مقصد کی کامیابی کی امید سے ہے۔ نہ اس انداز کی کامیابی جسے دنیا سمجھتی ہے بلکہ دوسرے رنگ کی۔ اس لیے کہ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ وقتی شکست بڑی کامیابی کا مقدمہ بن جاتی ہے جیسا کہ تھا۔ چنانچہ آج ساری اُمّت اس مقدمہ میں انقلاب کی تعریف کر رہی ہے۔ بلکہ اس مخدرہ کے ثبات و شجاعت سے قوت قلب کے درس حاصل کر رہی ہے۔ اسی عالم میں عورت کا ذہن اپنے ماضی کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ وہ وقت جب سعادت کی موجیں اس کی زندگی سے کھیل رہی تھیں۔ وہ وقت جب اس کا باپ زندہ تھا اور اس کا گھر قدیمی حکومت کا مرکز اور مستقل شرافتوں کا ستون محکم بنا ہوا تھا۔

شاید انہیں افکار میں وہ منظر بھی سامنے آگیا ہو جب اس کا باپ اسے اپنے سینے سے لگائے ہوئے عاقلانہ محبتوں سے اس کی تربیت کر رہا تھا۔ اور اس کے مقدس لبوں کے بوسے لے رہا تھا جو کہ صبح و شام اس کی روحانی غذا تھی۔

پھر خیال پلٹا اور یہ نظر آیا کہ اب زمانہ دوسرا ہو چکا ہے۔ اب وہ گھر کہ جو فانوس نور وحدت اور مرکز نبوت تھا جس کی شعاعیں عرش سے باتیں کر رہی تھیں چند جماعتوں کے درمیان گھرا ہوا ہے۔ اور اسکا وہ ابن عم جو کہ اسلام کی دوسری عظیم شخصیت ہے جو باب علم نبیؐ وزیر مخلص رسولؐ اور پاسبان رسالت ہے جس کی ابتداء ابتدائے رسالت سے متحد تھی۔ جو ابتداء میں رسولؐ کا ناصر اور انتہا میں اس کی امیدوں کی آماجگاہ تھا خلافت رسولؐ سے محروم ہو جاتا ہے۔ اور اس

کی وہ فضیلتیں جن کے زمین و آسمان شاہد ہیں ناقابل توجہ بنا دی جاتی ہیں۔ اور اس کے وہ اسلامی کارنامے جن میں وہ فرد تھا درجہ اعتبار سے ساقط کر دیے جاتے ہیں۔ اُن بعض موازین کی بنا پر جو اس وقت کی اصطلاح میں ڈھالے گئے تھے۔

اس وقت جتنا عورت کے مقدر میں تھا اس نے گریہ کیا۔ نہ وہ گریہ جو چہرے سے نمایاں ہو جائے اور سامنے سے جس کا اندازہ کر لیا جائے بلکہ وہ دل کے شعلے، نفس کا اضطراب، قلب کی گہرائی میں حسرتوں کی فراوانی اور نتیجہ میں چشم مقدس سے ٹپکتے ہوئے دو آنسو تھے۔

ابھی کچھ دیر نہ گذری تھی کہ یہ مخدرہ اپنی ہمجولیوں کو لیے ہوئے بھڑکتے شعلے کی طرح میدان جہاد تک پہنچی اور ایسا قیام کیا جو تاریخ میں دوامی حیثیت اختیار کر گیا۔ وہ جہاد کیا جس میں عورت کی جملہ امکانی قوتیں صرف کر دیں اور قریب تھا کہ نئے انداز کا جہاد خلافت وقت کو تباہ و برباد کر دے۔ اگر وقت کی شدت اور مصائب کی فراوانی حائل نہ ہو جاتی۔

(یہ مخدرہ ہیں) فاطمہ زہرا صدیقہ کبریٰ بنت رسولؐ ریحان نبوت مثال عصمت، شعاع نور وحدت اور مسلمانوں میں رسولؐ کی امانت جو کہ مسجد کی طرف اس عالم میں تشریف لے جا رہی ہیں کہ اپنے ہاتھوں سے ایسا باپ کھو چکی ہیں کہ جو تاریخ انسانیت میں محبت شفقت اور برکت کے اعتبار سے بے مثل و بے نظیر تھا۔ یہ حادثہ وہ ہے کہ جس سے انسان یا تو تلخی موت چکھنے پر آمادہ ہو جائے یا پھر موت اس کو انتہائی خوشگوار شیریں اور بہتر نظر آنے لگے۔ یہ ہیں فاطمہ زہراؑ کے اُس وقت کے حالات جب ان کے باپ نے اس دنیا سے رحلت کی اور جوار رحمت الٰہیہ

میں جگہ پائی۔

حالات کی تلخی اور شعور کی پختگی

حوادث انھیں سختیوں تک محدود نہ رہے۔ بلکہ فاطمہؑ کو ایک دوسرے حادثہ کا بھی سامنا کرنا پڑا جس کی تاثیر نفس طاہرہ میں باعتبار حزن والم ومصیبت واذیت پہلے حادثہ سے قطعاً کم نہ تھی۔ اور وہ یہ کہ خاندانِ رسالت کی قدیمی شرافت جو اُن کے پاس ابتدائے تاریخ سے تھی سلب کرلی گئی۔ یعنی سیادت امت اور زعامت ملت کا حق علیؑ سے چھین لیا گیا۔ منشار قدرت یہ تھا کہ آلِ محمدؐ امت رسولؐ کے ولی ہوں اس لیے کہ یہ اجزاء رسالت و نبوت ہیں۔ لیکن افسوس کہ حالات زمانہ نے ریاست کا رُخ موڑ دیا اور منصبِ حکومت کو آل رسولؐ سے چھین کر اپنے خودساختہ اُمراء و رؤساء کے حوالے کردیا۔ یہ وہ مصائب تھے کہ جن کی وجہ سے فاطمہؑ اپنی مقدس شرافتوں اور ابدی ریاستوں سے محروم ہوگئیں اور اس وقت ان کے مرکز آلام و احزانِ نفس نے انھیں اس اقدام پر آمادہ کیا۔

یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ اگر فاطمہؑ جیسا کوئی دوسرا انسان اس طرح اس قسم کے مجاہدات اور شجاعتوں کا مظاہرہ کرنا چاہتا تو حکومت کا لقمہ بن کر رہ جاتا۔ اس لیے کہ حالات اتنے ناگفتہ بہ ہوگئے تھے کہ اشاروں پر عتاب، گفتگو پر حساب اور افعال پر عقاب ہورہا تھا۔ بھلا کس کی مجال تھی کہ اس عالم میں حکومت کے احکام کی خلاف ورزی کرتا۔ پھر وہ احکام جن پر حکومت کی بنیاد اور اس کی اساس قائم ہو۔ ہاں

اگر مجاہدہ بنتِ رسولؐ، بضعۃ النبیؐ آئینہ جمال رسالت ہو تو بلاشک وبے خطر رہ سکتی ہے نہ کسی مادی طاقت کی بنا پر بلکہ اپنی انھیں شرافتوں کی بنا پر اور اس لحاظ سے کہ عورت کے ساتھ احکام حکومت میں مراعات کی جاتی ہے۔

انقلابی طاقتیں

ایک مرتبہ فاطمہؑ اپنے پاکیزہ خیالات کے ساتھ ماضی کی طرف متوجہ ہوتی ہیں اور باپ کا وہ زمانہ یاد کرتی ہیں جو کہ ان کے انتقال کے بعد فاطمہؑ کے ذہن میں بطور یادگار محفوظ رہ گیا ہے۔ جو ہر وقت فاطمہؑ کے نفس میں ایک نیا شعور اور تازہ احساس پیدا کررہا ہے۔ جس سے فاطمہؑ ہر وقت ایک نئی مسرت و لذت حاصل کرتی ہیں۔ فاطمہؑ اگرچہ بعد زمانہ کے اعتبار سے باپ سے دور ہوگئی ہیں لیکن خیالات و افکار کی وجہ سے باپ کے زمانہ سے ہمیشہ متحد ہیں۔

اب فاطمہؑ کے پہلو میں قوت کا سرچشمہ ہے جو خشک نہیں ہوسکتا۔ انقلابی طاقتیں ہیں جو کم نہیں ہوسکتیں۔ نبوت محمدؐ کی شعاعیں ہیں جو راہ نمائی کررہی ہیں۔

جب فاطمہؑ نے دل میں انقلاب کی ٹھان لی اور ایک مرتبہ اپنے احساسات کا سہارا لے کر ماضی کی طرف متوجہ ہوئیں تاکہ اس سخت وقت میں اپنے باپ کے تذکروں سے مدد حاصل کریں تو ایک مرتبہ فاطمہؑ نے زبان حال سے آواز دی۔

ایک نظر اس طرف اے صورت سعادت! فاطمہؑ تجھ سے چھٹ کر ایسی مشقتوں میں مبتلا ہوگئی ہے کہ جو ناقابلِ برداشت ہے۔

"اے عزیز ترین محبوب ترین روح! مجھ سے باتیں کر اور اپنے نور الٰہی کا فیضان کر جیسے کہ تو سابقاً کیا کرتی تھی۔

اے پدر بزرگوار! اگر آپ کو میری باتیں اچھی معلوم ہوں تو میں آپ سے باتیں کروں۔ میں اپنے غم واندوہ کو پراگندہ کرنا چاہتی ہوں۔ جیسا کہ آپ کے سامنے کیا کرتی تھی، میں آپ کو بتانا چاہتی ہوں کہ آپ کا سایۂ رحمت جو مجھے آتش دنیا سے بچاتا تھا اب باقی نہیں۔ شعر

اے بابا! آپ کے بعد وہ مصائب گزرے
کہ اگر آپ موجود ہوتے تو شاید اتنے مصائب ہم پر نہ پڑتے

اے ماضی کے تذکرو! ہمارے سامنے اپنی باتیں دہراؤ تاکہ میں اُن سے ایک جنگ کی بنیاد رکھوں۔ ایسی جنگ کہ جس میں کوئی سستی آنے نہ پائے۔ اُن لوگوں کے خلاف جو از خود یا بخواہش مردم میرے باپ کے منبر پر قابض ہو گئے ہیں اور حقوق آلِ محمدؐ کا خیال نہیں کرتے بلکہ بیت عصمت کو تباہ کرنے پر آمادہ ہیں۔ مجھے میرے باپ کی جنگیں یاد دلاؤ۔ کیا میرے باپ مجھ سے بیان نہیں کرتے تھے کہ میرا بھائی میدان کا مرد اور جہاد کا سپاہی تمام ساتھیوں سے بہتر ایسے سخت وقت میں جب سب میدان چھوڑ کر چلے جائیں ثابت قدم رہنے والا ہے۔ اے ماضی حبیب! کیا اس کے بعد ممکن ہے کہ میں دیکھوں کہ علیؑ زیر منبر ہوں اور ابوبکر بالائے منبر۔ لا واللہ

مجھے بتاؤ اے میرے باپ کے زمانے! کیا یہ ابوبکر وہی نہیں ہے کہ جس

پر سورۂ برأت کی تبلیغ کے سلسلے میں وحی الٰہی نے اعتماد نہ کیا تھا۔ کیا اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ علیؑ ہی وہ اسلامی نمائندہ ہے کہ جس پر ہر اسلامی مہم میں اعتماد ہونا چاہیئے۔

مجھے باقاعدہ وہ زمانہ یاد ہے جب میرے باپ جنگ کے لیے تشریف لے گئے تھے اور علیؑ کو اپنا نائب بنا دیا تھا تو لوگوں نے اس پر بڑی بڑی باتیں کیں لیکن علیؑ مثل کوہ ثابت قدم رہے اور آپ نے کوئی توجہ نہ کی۔ میں نے چاہا کہ علیؑ پیغمبرؐ سے اس کی شکایت کریں یہاں تک کہ انھوں نے رسولؐ سے جا کر بیان کیا اور اس حالت میں پلٹے کہ اُن کے چہرے سے آثار مسرت نمودار تھے۔ اور کمال مسرت سے میرے پاس آکر ایک آسمانی بشارت دی اور بیان کیا کہ رسولؐ نے استقبال عظیم کے بعد مجھے بمنزلہ ہارونؑ قرار دیا۔ اے زمانے! ہارون موسیٰ تو شریک حکومت اور امامت امت ہوں لیکن ہارون محمدؐ کان مناصب سے محروم کر دیا جائے یہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔

اب تصورات فاطمہؑ پکار اُٹھے۔ یہی وہ انقلاب ہے جس کی خبر قرآن نے دی ہے۔ اے اصحاب محمدؐ! رسولؐ کے بعد دین جاہلیت کی طرف پلٹ نہ جانا۔ یقیناً یہی وہ لوگ ہیں جو دین سے پلٹ گئے۔ ان پر جاہلی منطق نے غلبہ کر لیا ہے۔ اسی لیے سقیفہ میں ایک فریق نے اپنی کثرت و عزت کو پیش کیا اور دوسرے نے اپنی

حدیث منزلت صحیح بخاری و مسلم و خصائص نسائی و مستدرک حاکم و جامع ترمذی و مروج الذہب مسعودی وغیرہ میں موجود ہے۔ ریاض النضرہ ج ۲ ص ۲۱۴

قرابت کو۔ اور قرآن و سنت کو درجہ اعتبار سے ساقط کر دیا گیا۔ پھر آواز دی اے وامین محمدؐ! کہ جو میری رگ و پے میں خون کی طرح دوڑ رہے ہیں یہ وہی عمر ہے کہ جس نے مکہ میں تجھ پر ہجوم کیا۔ اور آج ہم اہلبیت کے دروازہ پر آکر آگ جلا رہا ہے۔

اے روح مادری! جہاد اسلامی کا وہ درس آپ نے مجھے دیا ہے جو ناقابل فراموش ہے۔ آپ نے بابا کے شانہ بہ شانہ جہاد کیا میں بھی آپ کے نقش قدم پر ہوں لبیک! لبیک! اے مادر گرامی! میرے دل کی گہرائیوں میں آپ کی آوازیں ہیں جو مجھے حکام وقت کے مقابلہ پر آمادہ کر رہی ہیں۔

مادر گرامی! میں عنقریب ابوبکر سے جا کر کہوں گی کہ تو نے بابا پر بہتان باندھا ہے۔ میں تو دنیا سے چلی جاؤں گی لیکن قیامت میں تجھ سے ملاقات کروں گی اس عالم میں کہ حاکم اللہ ہوگا۔ رئیس و زعیم میرا باپ ہوگا اور موقف قیامت کا ہوگا۔ میں چاہتی ہوں کہ مسلمانوں کو ان کے انجام سے آگاہ کر دوں۔ اور انھیں وہ سیاہ مستقبل دکھا دوں جو کہ انھوں نے اپنے ہاتھوں تاریک بنایا ہے۔ میری تمنا ہے کہ میں ان سے کہدوں کہ تم نے خلافت کو دودھ کی خاطر حاملہ بنایا ہے لیکن عنقریب یہ دودھ خون کی شکل اختیار کرلے گا۔ اس میں اہل باطل گھاٹے میں رہیں گے اور سابقین کے نقش قدم پر چلنے والے پہچان لیں گے کہ ان کی بنیاد کیسی تھی۔

فاطمہؑ میدان عمل کی طرف چلیں اس عالم میں کہ ان کے دل میں محمدی توانین علوی شجاعت، خدیجہ کی روحانیت اور امت کی شفقت اور ہدایت کا جذبہ تھا۔

راہِ انقلاب

کھلی ہوئی بات ہے کہ وہ راہ جو فاطمہؑ زہرا نے انقلاب کے لیے طے کی کچھ طولانی نہ تھی۔ اس لیے کہ جس گھر سے انقلابی شرارے اٹھے تھے وہ علیؑ کا گھر تھا جس کو اصطلاح رسولؐ میں بیت النبوۃ کہا جاتا تھا۔ اور یہ گھر مسجد کے ہمسایہ میں تھا۔ اس طرح کہ مسجد اور گھر کے درمیان ایک دیوار سے زائد کا فاصلہ نہ تھا۔ اس مقام پر دو احتمال ہیں۔ یا فاطمہؑ اس دروازہ سے داخل ہوئیں جو مسجد کے اندر تھا یا پھر صدر دروازہ سے۔ اگرچہ یہ زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ شہزادیؑ صدر دروازہ سے آئی ہوں جیسا کہ سیاق تاریخ سے معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے کہ خصوصی دروازہ سے آنے میں مسجد سے ابوبکر تک جانے میں کوئی دیر نہ لگتی اور نہ چلنے کی ضرورت تھی۔ حالانکہ راوی فاطمہؑ کی رفتار کی توصیف کرتا ہے کہ پیغمبر اسلامؐ کی رفتار سے ذرا بھی مختلف نہ تھی۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہ توصیف اس چال کی ہے جو ابوبکر تک پہنچنے میں دیکھی گئی تھی۔ تو خلاف عربیت ہوگا۔ اس لیے کہ مسجد میں قدم رکھنا ہی ابوبکر کے سامنے جانے کے مرادف ہے۔ بہرحال قرائن سے اندازہ ہوتا ہے کہ فاطمہؑ صدر دروازہ سے داخل ہوئیں۔

فاطمی مظاہرہ کے شرکاء

روایت بتلاتی ہے کہ فاطمہؑ کے ساتھ کچھ ہم قوم و قرابت عورتیں بھی تھیں۔ اس اجتماع اور صدر دروازے سے جانے کا مقصد صرف ایک تھا اور

وہ لوگوں کو متوجہ کرنا ۔ اور ان کے التفات کو اس امر کی طرف مبذول کرنا کہ وہ مسجد میں جمع ہو کر یہ دیکھیں کہ فاطمہؑ کا مقصد کیا ہے اور بنتِ رسولؐ کیا کہنا چاہتی ہے ۔ تاکہ طرفین کے درمیان مقدمہ علی الاعلان ہو ۔ اور دنیا حق و باطل میں بآسانی امتیاز پیدا کر سکے ۔

ایک منظر اور اس کا پس منظر

روایت نے یہ بتایا کہ فاطمہؑ پیغمبرؐ کی رفتار سے مسجد میں تشریف لائیں ۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس فلسفہ کو واضح کیا جائے ۔ اس میں ایک احتمال تو یہ ہے کہ یہ فاطمہؑ کی عادت رہی ہو اس لیے کہ یہ بیٹی جملہ افعال و اقوال میں باپ سے مشابہ تھی اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ فاطمہؑ نے قصداً یہ رفتار اختیار کی ہو اور یہ چاہا ہو کہ عوام کے خیالات اور جمہور کے احساسات کا رُخ ماضی قریب کی طرف موڑ دیں تاکہ وہ اس دور کو یاد کریں جب اسی مخدرہ کے باپ کے سایہ رحمت میں چین کی زندگی بسر کر رہے تھے ۔ اور یہی احساس و شعور وہ ہے کہ جو فاطمہؑ کے بیان کی تمہید ہو جائے گا ۔ اور لوگوں کو دعوت فاطمہؑ کے قبول کرنے پر آمادہ کرے گا ۔ اور فاطمہؑ کو آئندہ کے اقدامات میں کامیاب بنائے گا چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ قلب راوی متاثر ہوا اور اس نے شعوری یا لاشعوری طور پر جملہ تاریخی وقائع کے ساتھ فاطمہؑ کی رفتار کا تذکرہ بھی کر دیا ۔

ایک کلمہ آمال و آلام انقلاب کے متعلق

یہ ایک فاطمی فریاد تھی جس کو آسمانوں نے سُنا اور اب یہی آواز حقیقت مذبوحہ اور اقدام مایوس کا مرکز بن گئی ۔ جس کے بعد کچھ چہروں پر امید کی مسکراہٹ نظر آئی ۔ لیکن آخر تک پہنچتے پہنچتے یہ مسکراہٹ بجائے قہقہہ سسکیوں میں بدل گئی ۔ اور مسلمانوں کو دائمی مایوسی کا سامنا کرنا پڑا ۔

یہ وہ انقلاب تھا جس سے انقلاب برپا کرنے والی عورت کا مقصد کچھ نہ تھا سوائے اس کے کہ یہ انقلاب تاریخ کے صفحات پر ثبت ہو جائے اور دنیا پر حق و باطل نمایاں ہو جائیں ۔ اس اعتبار سے یہ انقلاب انتہائی کامیابی کے ساتھ ختم ہوا ۔ اگرچہ نگاہِ مادی اسے ناکام سمجھی ۔ اس کی کامرانی کی وضاحت آئندہ کی جائے گی ۔



۲۔ فدک

بمعنی حقیقی	بمعنی رمزی (مجازی)	
حقیقتاً فدک ہمارے ہاتھوں میں تھا	حدِّ اول فدک	عدن
لیکن ایک قوم نے اس کی طمع کی اور	حدِّ ثانی	سمرقند
دوسری نے اس کا ساتھ دیا۔	حدِ ثالث	افریقیہ
زوجِ بتول علی ابن ابی طالبؑ	حدِ رابع	سیف البحر قریب
		جزائر آرمینیہ

• ابن الزہرا موسیٰ بن جعفرؑ

فدک تاریخ اسلامی کے ابتدائی دور میں

فدک مدینہ سے دو یا تین دن کے فاصلہ پر حجاز کا ایک قریہ ہے۔ ابتدائے تاریخ سے یہ یہودیوں کی زمین تھی چنانچہ ۷ھ تک یہودی اس پر قابض رہے۔ ۷ھ میں ان لوگوں نے خوفِ رسولِ اسلام سے نصف یا پورے فدک کا رسولؐ سے مصالحہ کرلیا۔ اس دن سے فدک کی اسلامی تاریخ کا آغاز ہوا۔ اور یہ ملکِ خاص رسولؐ اسلام بنا۔ اس لیے کہ مسلمانوں نے یہاں کوئی جنگ نہ کی تھی۔ پیغمبرؐ نے یہ زمین فاطمہؑ کے حوالہ کردی۔ وقت وفاتِ نبیؐ اکرم تک فدک انھیں کے ہاتھوں میں رہا۔ اس کے

بعد بقول ابن حجر خلیفہ نے اسے فاطمہؑ سے چھین لیا۔ اور اس کو اہم مالی مصدر اور حکومت اسلامی کی عمدہ ثروت قرار دے لیا۔ یہاں تک ع۱ کہ خلافت عمر کو ملی اس نے فدک وارثانِ رسولؐ کو دے دیا اور یہ زمانہ عثمان تک اُن کے قبضہ میں رہا۔ عثمان نے اسے مروان بن الحکم کو بخش دیا۔ اس کے بعد تاریخ خاموش ہوجاتی ہے۔ لیکن اتنا بہرحال ثابت ہے کہ علیؑ نے بنی امیہ کے توسط سے غارت شدہ جملہ اموال کے ساتھ فدک بھی مروان سے چھین لیا۔

فدک عہدِ امیرؑ المومنین میں

خلیفۂ وقت کے بعض حمایت کنندگان کا خیال ہے کہ فدک علیؑ کے زمانہ میں بھی شیخین ہی کی طرح استعمال ہوتا رہا ہے۔ اور یہ دلیل ہے اس امر کی کہ فدک علیؑ کی نظر میں حقِ خاص فاطمہؑ نہیں تھا۔ میں اس وقت تقیہ کی بحث چھیڑ کر امیرالمومنینؑ کی سیرت کی توجیہ نہیں کرنا چاہتا۔ بلکہ میں اس بات سے انکار کرتا ہوں کہ علیؑ نے فدک میں سیرتِ صدیقی پر عمل کیا ہو۔ اس لیے کہ تاریخ میں اس کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ اتنا ضرور ہے کہ علیؑ فدک کو اولادِ فاطمہؑ کا حقِ خاص ضرور سمجھتے تھے۔ جیسا کہ آپ نے اس کا اظہار عثمان ابن حنیف کے مکتوب میں فرمایا ہے۔ بنابریں ممکن ہے کہ آپ حاصلاتِ فدک صرف اولادِ فاطمہؑ پر صرف کرتے رہے ہوں۔ اور اس امر کی تاریخی شہرت بھی ضروری نہیں ہے۔ اس لیے کہ مال مالکِ حقیقی ہی کے

ع۱ اس بیان کی ذمہ داری اہلِ تاریخ پر ہے۔

ہاتھ میں تھا۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ آپ غلات فدک کو مصالح مسلمین میں صرف کرتے رہے ہوں۔ لیکن وارثانِ فاطمہؑ کی اجازت سے جیسا کہ ایک احتمال ہے کہ اولادِ فاطمہؑ نے فدک کو وقف کر کے صدقہ عامہ قرار دے دیا ہو۔

فدک اور حکومتوں کی عالمی سیاست

اس کے بعد جب معاویہ حاکم بنا تو اس نے حق مغصوب کا اور بھی استخفاف کیا اور ایک ثلث فدک مروان بن الحکم اور دوسرا عمر بن عثمان اور تیسرا ثلث اپنے بیٹے یزید کو دے دیا۔ یہ لوگ اس پر متصرف رہے۔ یہاں تک کہ تمام فدک مروان کے ہاتھ لگ گیا۔ اس کے بعد عمر بن عبدالعزیز بن مروان قابض ہوا۔ اس نے فدک اولادِ فاطمہؑ کو واپس کر دیا اور والی مدینہ ابوبکر بن عمرو بن حزم کو خط لکھا کہ یہ اولادِ فاطمہؑ کو دے دیا جائے۔ اس نے جواب دیا۔ فاطمہؑ کی اولاد آلِ عثمان اور آلِ فلاں و فلاں میں بھی ہے میں کس کو دوں؟ اس نے پھر لکھا کہ اگر میں تجھے کسی گائے کے ذبح کرنے کا حکم دیتا تو تو اس کا رنگ پوچھتا۔ لہٰذا اب میرا خط پاتے ہی فوراً اسے اولادِ فاطمہؑ پر تقسیم کر دے جو کہ علیؑ کی اولاد میں ہوں۔ بنی امیہ نے اس بات سے عمر ابن عبدالعزیز پر سخت اعتراض کیا اور کہا کہ تو نے شیخین کی توہین کی۔ بعض کا

؎ یہ احتمال زیادہ قوی ہے اسلیئے کہ اگر صرف اولادِ فاطمہؑ پر صرف ہوتا تو دوسرے لوگوں کے دیدینے کا کیا مطلب ہے جیسا کہ مکتوب ابن حنیف میں ہے۔ یا اگر وقف ہوتا تو پھر اولادِ فاطمہؑ کے لیے واپس لینا کیوں کر جائز ہوتا ہ

خیال ہے کہ عمرو بن قیس ایک جماعت اہل کوفہ کے ساتھ اس کے پاس گیا اور سخت عتاب کیا۔ اس نے کہا تم جاہل ہو۔ اور میں عالم۔ تم بھول گئے اور میں نے یاد رکھا ہے۔ ابوبکر بن محمد بن عمرو بن حزم نے اپنے باپ سے انھوں نے اپنے جد سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا تھا کہ فاطمہؑ میری پارۂ جگر ہے۔ جس نے اسے ناخوش کیا اس نے مجھے ناراض کیا اور جس نے اسے خوش کیا اس نے مجھے راضی کیا۔ یاد رکھو فدک عہد ابوبکر و عمر میں ان کے پاس تھا اس کے بعد مروان کے ہاتھ لگا۔ اس نے میرے باپ عبدالعزیز کو دیا اب ہم اس کے وارث ہوئے۔ کچھ حصے ہمارے بھائیوں نے ہمیں ہبہ کر دیے کچھ ہمارے ہاتھ فروخت کر دیئے۔ اب جب تنہا ہماری ملک ہے تو ہم جسے چاہیں دے دیں تمہیں حقِ اعتراض نہیں۔ وہ بولے اگر ایسا ہی ہے تو اصل فدک رکھ لے اس کے منافع ان پر تقسیم کر دے۔ اس نے ایسا ہی کیا۔

اس کے بعد یزید بن عبدالملک نے فدک اولادِ فاطمہؑ سے چھین لیا اور وہ اولادِ مروان میں ان کے خاتمہ تک رہا۔

جب ابوالعباس سفاح خلیفہ بنا تو اس نے فدک عبداللہ بن الحسنؑ بن الحسنؑ بن علیؑ ابن ابی طالب کو پلٹا دیا۔ ابوجعفر منصور نے زمانہ حکومت میں بنی حسنؑ سے چھین لیا۔ مہدی بن منصور نے فاطمیین کو دے دیا۔ موسیٰ بن مہدی نے پھر لے لیا اور یوں ہی بنی عباس کے ہاتھ میں رہا یہاں تک کہ مامون خلیفہ ہوا اس نے سنہ ۲۱۰ھ میں بنی فاطمہؑ کو واپس کر دیا۔ اور اپنے والی قثم بن جعفر کو مدینہ لکھا۔ اما بعد۔ امیرالمومنین دین خدا خلافت رسولؐ اور قرابت نبیؐ میں ایک

خاص مقام کی بنا پر زیادہ مستحق ہے کہ سنت پیغمبرؐ پر عمل کرے اور رسولؐ کے صدقات وہبات کو اس کے اہل تک پہونچا دے۔ اللہ امیرالمومنین کو توفیق دے اور خطاؤں سے محفوظ رکھے اور ان میں رغبت عمل کا جذبہ پیدا کرے۔ اور یہ بات واضح ہے کہ فدک کو پیغمبرؐ نے فاطمہؑ کو عطا کر دیا تھا۔ اس سلسلے میں آج تک کوئی اختلاف پیدا نہیں ہوا ہے۔ اب امیرالمومنین کی بھی رائے ہے کہ اسے ان کے ورثہ کو واپس کر دے۔ اس لیے کہ اقامہ حق و عدل ہی وسیلہ تقرب الٰہی ہے۔ اور تنفیذ امر و اعطاء صدقات ہی وسیلہ قربت رسولؐ ہے۔ امیر کا حکم ہے کہ اس امر کو دیوانوں میں حفظ کر لیا جائے اور عاملین کو اس طرح کی اطلاع دے دی جائے۔ بلکہ اگر بعد وفات نبیؐ اکرم سے ہر موسم میں منادی کرا دی جاتی کہ ہر شخص اپنے صدقات و عطایا کا تذکرہ کرے تاکہ اس کا قول قبول کیا جائے تو اس امر میں فاطمہؑ سب سے زیادہ مستحق ہے کہ ان کا قول مانا جائے۔ اب امیرالمومنین نے ایک خط اپنے غلام مبارک طبری کو بھی لکھوا دیا ہے کہ فدک جملہ حدود کے ساتھ بنی فاطمہؑ کو رد کر دے۔ اور ان کے جملہ حقوق و غلات و غلام وغیرہ کا تحفظ کرے۔ اور یہ تمام اموال محمد بن یحییٰ بن الحسینؑ بن زید بن علیؑ ابن الحسینؑ بن علیؑ ابن ابی طالب اور محمد بن الحسنؑ بن علیؑ ابن الحسینؑ بن علیؑ ابن ابی طالب کو دے دیے جائیں۔ یہ دونوں امیر کی طرف سے ولی امر ہیں۔ اس رائے کو بخوبی سمجھ لے۔ اس امر کے لیے خدائی الہام اور توفیق غیبی ہے جس سے امیر کو تقرب خدا و رسولؐ حاصل ہوگا۔ اب تجھے چاہیے کہ محمد بن یحییٰؑ اور محمد بن عبداللہ کے ساتھ وہی سلوک کرے جو مبارک طبری کے ساتھ کرتا تھا۔ بلکہ تجھے ان دونوں کی اعانت کرنی چاہیے تاکہ غلات میں اضافہ ہو اور قریہ باقاعدہ آباد ہو سکے۔

فقط۔ والسلام۔

جب متوکل کی بیعت کی گئی تو اس نے فدک کو فاطمیین سے چھین لیا اور اس کو عبداللہ بن عمر بازیار کے حوالہ کر دیا اس باغ میں ۱۱ خرمہ کے درخت تھے جنہیں خود رسولؐ اکرم نے لگایا تھا۔ عبداللہ ابن عمر نے ایک شخص کو مدینہ بھیجا جس کا نام بشران بن ابی امیہ ثقفی تھا۔ اس نے وہاں پہونچ کر تمام درخت کاٹ ڈالے۔ جب پلٹ کر آیا تو مفلوج ہو گیا فاطمیین کا فدک سے آخری تعلق عہد متوکل تک رہا۔ اس کے بعد یہ ابن عمر بازیار کے ہاتھوں میں پہنچ گیا۔

یہ فدک کی ایک مختصر داستان پریشان ہے جو کسی ایک قاعدہ و قانون پر درست نہیں ہو سکتی۔ بلکہ یہ داستان خواہشات و ہوا و ہوس کی پیداوار ہے کہ جو سیاست وقت کے اعتبار سے بدلتی رہی۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ فدک بالکل خالی از عدل و انصاف بھی نہیں اس لیے کہ کبھی کبھی یہ مال اپنے مالک تک بھی پہنچا ہے۔ اتنا ضرور معلوم ہے کہ اجتماع اسلامی میں فدک نے بڑی اہمیت پیدا کر لی تھی یہی وجہ ہے کہ اس مشکل کا ہر عہد میں نیا حل پیدا کیا گیا۔ اور ہر شخص نے اہلبیتؑ سے اپنے تعلق کے اعتبار سے اس میں تصرف کیا۔ اگر حاکم کی رائے معتدل و مستقیم رہی تو اس نے فدک اس کے وارث اصلی کو واپس کر دیا اور اگر عقل و رائے میں فتور پیدا ہو گیا تو غصب فدک بادشاہ وقت کا پہلا کارنامہ قرار پایا۔ نظر اسلامی میں فدک کی قیمت معنویہ کا اندازہ دعبل خزاعی کے اس قصیدہ سے ہوتا ہے جو انہوں نے مامون کے رد فدک کے وقت نظم کیا تھا۔ جس کا مفہوم یہ ہے: "آج زمانے کے چہرہ پر تبسم کی لہریں دوڑ رہی ہیں اس لیے کہ مامون نے فدک کو اس کے حقیقی مالک کے ہاتھوں میں دے دیا ہے۔

فدک کی مادّی اہمیت اور اس کے دلائل

اِس مقام پر یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ فدک کسی معمولی زمین یا باغ کا نام نہیں ہے جیساکہ بعض کا خیال ہے بلکہ یہ بلاخوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ فدک کے اموال سے ایک ثروت مہمہ کی تشکیل ہو سکتی تھی۔ البتہ اس کی ضرورت نہیں ہے کہ میں اس کی سالانہ آمدنی کا حساب کروں۔ اگرچہ بعض روایات میں اس کی بڑی مقدار بیان کی گئی ہے۔

فدک کی مادی قیمت پر چند امور دلالت کرتے ہیں۔

(۱) عمر نے ابوبکر کو فدک کی واپسی سے یہ کہہ کر منع کیا کہ اگر فدک نکل گیا تو اسلام کی آمدنی کم ہو جائے گی حالانکہ مانعین و مرتدین کے خلاف جہاد کے لیے اس وقت بڑی ثروت کی ضرورت ہے۔ یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ وہ زمین جس کے حاصلات سے حکومت کا معیار بلند کیا جاسکے اور سخت اوقات میں فوجوں کی تشکیل دی جاسکے وہ کوئی معمولی باغ نہ ہوگا۔

(۲) خلیفۂ وقت نے صدیقہ طاہرہؑ سے گفتگو کے دوران میں یہ کہا تھا کہ یہ مال خاص نبیؐ اکرم کا نہیں ہے۔ بلکہ مال مسلمین تھا جس سے پیغمبرؐ لشکر سازی کیا کرتے تھے اور اسے راہِ خدا میں صرف کیا کرتے تھے۔ اہلِ انصاف بتائیں کیا یہ کام معمولی زمین سے لیا جاسکتا ہے؟

(۳) تاریخ شاہد ہے کہ معاویہ نے فدک کو تین حصوں پر تقسیم کر دیا تھا۔ واضح بات ہے کہ معمولی زمین کی آمدنی تین بڑے سرمایہ داروں پر تقسیم نہیں کی جاسکتی۔

(۴) معجم البلدان نے فدک کو قریہ سے تعبیر کیا ہے اور ابن ابی الحدید نے اس کے درختانِ خرمہ کو کوفہ کے چھٹی صدی ہجری کے خرموں کے برابر تحریر کیا ہے۔



۳- تاریخِ انقلاب

قَدْ كَانَ بَعْدَكَ أَنْبَاءٌ وَهَنْبَثَةٌ

لَوْ كُنْتَ شَاهِدَهَا لَمْ تَكْثُرِ الْخُطَبُ

(اے پدر بزرگوار آپ کے بعد بڑے بڑے مصائب پیش آئے ؛ اگر آپ موجود ہوتے تو شاید مصائب کی فراوانی نہ ہوتی)

أَبْدَتْ رِجَالٌ لَنَا نَجْوَى صُدُورِهِمِ

لَمَّا مَضَيْتَ وَحَالَتْ دُونَكَ التُّرَبُ

(کچھ لوگوں نے اپنے دلی کینوں کا اس وقت اظہار کیا ؛ جب آپ نے دنیا سے انتقال فرمایا اور میرے اور آپ کے درمیان زمین حائل ہوگئی۔)

صُبَّتْ عَلَيَّ مَصَائِبُ لَوْ أَنَّهَا

صُبَّتْ عَلَى الْأَيَّامِ صِرْنَ لَيَالِيَا

(اے پدر بزرگوار! آپ کے بعد مجھ پر مصائب انڈیل دیئے گئے ؛ کہ اگر یہ مصائب دنوں پر پڑتے تو مثل شبہائے تاریک ہوجاتے۔)

قَدْ كُنْتُ أَرْتَعُ تَحْتَ ظِلِّ مُحَمَّدٍ

لَا أَخْتَشِي ضَيْمًا وَكَانَ جَمَالِيَا

(میں پیغمبرؐ کے زیر سایہ اس شان سے زندگی بسر کر رہی تھی ؛ کہ مجھے کسی ذلت و رسوائی کا خوف نہ تھا اور میرا وقار باقی تھا۔)

وَالْيَوْمَ أَخْضَعُ لِلذَّلِيلِ وَأَتَّقِي

ضَيْمِي وَأَدْفَعُ ظَالِمِي بِرِدَائِيَا

(مگر افسوس کہ آج ایک ذلیل کی تابع بنائی گئی ہوں ؛ اب میں ذلت سے خوف زدہ ہوں اور ظالم کو اپنی چادر سے دفع کر رہی ہوں۔)

تاریخی بحث کے قوانین و قواعد

اگر نتیجہ خیز حیات فکری اور فنی درس عقل کے لیے ذاتی عقائد سے تجرد، سنجیدگی حکم اور حریت فکر ضروری اشیاء ہیں تو پھر اسلاف کے کارناموں کی تاریخی بنیاد قائم کرنے کے لیے بھی ان اشیاء کی اشد ضرورت ہوگی تاکہ ان کی حیات سے وہ خد و خال نمایاں ہوسکیں کہ جو تاریخ کی ملکیت بن کر رہ گئے ہیں۔ اور ان کی شخصیت کے وہ عناصر سامنے آسکیں جو ان میں تھے یا جنھیں زمانہ نے ان میں محسوس کیا۔ اور اس طرح سے گزشتہ ادوار کے لیے انسانی فکر و تامل کا میدان وسیع ہوسکے۔ اور یوں انسان اسلاف کی حیات کو خاصۃً و عامۃً دینی، اخلاقی اور سیاسی موازین پر پرکھ سکے۔ بشرطیکہ

اس تامل وفکر کا منبع عالم اجتماع انسانی ہو نہ کہ ذاتی عقائد وخیالات اور آبائی تقلید وتعبد کہ اس طرح انسان چند اوہام پر تحقیق کی پوری عمارت قائم کر دیتا ہے۔ جس کا دوام چند ساعت کے لیے بھی نہیں ہوتا۔

لیکن اگر ہم تاریخ پر گہری نظر ڈالیں نہ اس لیے کہ ہم واقعات کا مطالعہ کریں اور نہ اس لیے کہ اپنی بحث کو چند علمی قواعد میں محدود کر دیں اور نہ اس لیے کہ ہر واقعہ کے تقدیرات واحتمالات کو جمع کر کے ان کی تصحیح وتغلیط کریں۔ بلکہ اس لیے کہ ہم اسلاف کے کارناموں سے اپنے احساسات ومشاعر کو زندہ کریں تو اس حالت میں یہ اُن لوگوں کی تاریخ نہ ہوگی جو روئے زمین پر چند خاص احساسات ومشاعر کے ساتھ زندہ رہے اور اچھے یا برے کردار کو پیش کر کے دنیا سے اُٹھ گئے بلکہ یہ اُن شخصیتوں کی سوانح نگاری ہوگی جنھوں نے ہمارے اذہان میں زندگی کی ہے اور جن کے خیالات نے ہمیں افکار کی انتہائی بلندیوں تک پہنچا دیا ہے۔

پس اگر کوئی شخص چاہتا ہے کہ فکری آزادی حاصل کرے اور دنیا کی تاریخ مرتب کرے نہ روایاتی حیثیت سے کہ جو ذہن میں آئے اسے تحریر کر دے بلکہ حقیقت بیانی کے لحاظ سے تو اسے چاہیے کہ اپنے ذاتی عقائد کو الگ کر دے۔ اور اگر یہ ممکن نہیں ہے تو کم از کم تاریخی بحثوں سے ان کو الگ رکھے۔ اس لیے کہ عقائد انسان کی ذاتی ملکیت ہیں اسے کوئی سلب نہیں کر سکتا۔ حقیقت بیانی خود اس امر کی طالب ہے کہ امانت ودیانت سے کام لیا جائے اور تاریخ انسانیت صحیح فکر کے ساتھ نتیجہ خیز انداز سے مرتب کی جائے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ذاتی عقائد مورخین کو تعدد نظر سے روک دیتے ہیں۔ چنانچہ مورخین یا اکثر کی یہ عادت ہو گئی ہے کہ وہ واقعات چند خاص قواعد کے ساتھ

لکھ دیتے ہیں اور اس طرح حقائق وہ شکل اختیار کر لیتے ہیں کہ اُن میں وقتی حسن نظر آنے لگتا ہے۔ لیکن حقیقتاً ان وقائع کو دنیائے انسانیت کے نشاط وارتقاء سے کوئی لگاؤ نہیں ہوتا۔ عنقریب ہم ان باتوں کے شواہد اُس عصر کے حالات سے پیش کریں گے جو تاریخ اسلامی کا انتہائی پُرآشوب دور ہے اور بعد وفات نبی جس وقت کہ اسلام کا بنیادی مسئلہ ایک ایسی شکل میں حل ہو رہا تھا کہ جو ناقابلِ تغیر ہو یعنی مسئلہ خلافت وریاست امور مسلمین۔

صدر اسلام کی عظمت اور جواز تنقید

ہر مسلمان کی خواہش ہے کہ عصر اوّل کی تاریخ انتہائی پاکیزہ ہو۔ اس میں حیات انسانی کے ساتھ شر وفساد کا اختلاط نہ ہو سکے اس لیے کہ اُس دور میں خیر کے نمونے بکثرت موجود تھے۔ اس دور کا موجد ایک انسان اکبر تھا۔ جس نے حیات انسانیت کے مخفی پہلوؤں کو اُجاگر کر دیا اور جس کے دور میں عقیدہ الوہیت اس منزل تک پہنچ گیا تھا جہاں تک فلاسفہ الوہیت کے طائر اوہام پر نہیں مار سکتے تھے۔ جب نبی اکرم کا روحانی عکس عصر اوّل پر پڑا تو اسے پیغمبری سانچے میں ڈھلنا ہی چاہیے۔ چنانچہ محبین کی ایک جماعت تو اس طرح اس سانچے میں ڈھل گئی کہ ان کے اذہان میں سوائے تصور رسالت اور کوئی خیال ہی نہ رہا۔ وہی اُن کے وجود کا مبداء اور وہی ان کا استاد اکبر تھا جس نے اپنی ذات کو الوہیت میں اس طرح فنا کر دیا تھا کہ وقت نزول وحی سوائے صوت الٰہی کوئی آواز نہ سنتا تھا۔ اس کی نظر میں چار دانگ عالم میں سوائے جلوہ وحدت اور کچھ نہ تھا۔

وہ زمانہ جب مادی امتیازات کے موازین لغو قرار دے دیے گئے ہوں اور قانون کی نظر میں حاکم و محکوم برابر ہو گئے ہوں۔ جب کہ معیار قیمت معنوی اور مدار کرامت تقویٰ الٰہی کو قرار دے دیا گیا ہو جس سے ارواح کی پاکیزگی اور ضمیر کی حفاظت ہوتی ہو جو نفس انسانی کو آفاق عالیہ تک پہنچا دے۔ جس کے قوانین میں غنی کا احترام بوجہ سرمایہ اور فقیر کی توہین بوجہ غربت حرام ہو۔ جس نے انسان کو بقدر عمل اہمیت دی ہو۔ (لها ما كسبت وعليها ما اكتسبت) وہ زمانہ تھا جس میں انسانیت کی فلاح کے لیے جہاد ہو رہے تھے تاکہ شخصی شرف و فوقیت کو لغو قرار دیا جائے اور دنیاوی کرامتوں کو حساب بے ساقط کر دیا جائے۔

اقول۔ وہ زمانہ جو ان مفاخر و کرامات کا مجمع ہو حقیقتاً اس امر کا مستحق تھا کہ اس کی تقدیس اور اس کا احترام کیا جاتا۔ لیکن افسوس کہ مجھے کوئی طاقت اس امر پر مجبور کر رہی ہے کہ ایک ایسے موضوع کو وسعت دوں جو مجھ سے متعلق نہیں ہے۔ بہر حال میں اپنے موضوع کا خیال رکھتے ہوئے چاہتا ہوں کہ مختصر حالات اس زمانہ کے متعلق بیان کر دوں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ زمانہ روحانیت اور نورانیت کے اعتبار سے قابل فخر تھا لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ اس کا باقاعدہ مطالعہ نہ کیا جائے اور اس زمانہ کے کسی مسئلہ پر صحیح طریقہ سے بحث و تمحیص نہ کی جائے یا یہ نہ کہا جائے کہ مسئلہ فدک میں ایک نہ ایک خطا ضرور تھا۔ یا یہ رائے نہ قائم کی جائے کہ خلافت سقیفہ وقتی چارہ جوئی کا نتیجہ نہیں ہے۔ بلکہ قدیمی سازش کا اثر ہے۔ خواہ تاریخ ان تمام باتوں کا ثبوت ہی کیوں نہ پیش کر دے۔ کلا واللہ۔

ایک جماعت کا خیال ہے کہ گزشتہ زمانہ یعنی ابوبکر و عمر اور ان کے امثال

کے کارناموں پر تنقیدی نظر نہیں ڈالنی چاہیے اس لیے کہ یہ لوگ حیات اسلامیہ کے ذمہ دار اور اسلامی سنہری شاہراہوں کے بانی تھے۔ ان کی تاریخ پر کسی قسم کا اعتراض کرنا اسلامی تاریخ کو بدنما بنانا ہے اور مسلمانوں کے اس دور کے جذبات کو ٹھیس لگانا ہے۔

میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ ایک مختصر کلمہ کہہ دوں۔ کہ جو ایک طویل بحث کی بنیاد ہے۔ اس لیے کہ اس مسئلہ کو طول دینا ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ میں ان مورخین سے صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ یہ اسلامی وقار۔ یہ عصر اوّل کی نورانیت یہ صدر اسلام کی روحانیت کیا صرف ابوبکر و عمر کے وجود کا نتیجہ ہے؟ کیا ان کو ان روحانیتوں میں کوئی مدخلیت حاصل ہے؟ اس کا تفصیلی حل تو طوالت طلب ہے البتہ مختصر یہ ہے کہ اس عصر کی تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ اس وقت مسلمانوں میں دینی حمایت اور عقیدہ پر لڑ مرنے کا جذبہ آخری منزل پر تھا۔ یہاں تک کہ تاریخ بیان کرتی ہے ایک روز عمر نے منبر پر پوچھ لیا کہ اگر ہم معروف کو منکر بنا دیں تو تم کیا کرو گے تو ایک شخص بول اٹھا ہم تم کو توبہ کا حکم دیں گے۔ اگر توبہ کر لو گے تو قبول کر لی جائے گی۔ عمر نے کہا اگر نہ کریں تو۔ وہ بولا تمہاری گردن اڑا دیں گے۔ عمر نے کہا شکر ہے اس معبود کا کہ جس نے امت میں ایسے افراد پیدا کر دیے جو ہماری غلطیوں کی اصلاح کر سکتے ہیں۔

یہ بھی یقینی امر ہے کہ حزب مخالف یعنی اصحاب علیؑ خلافت وقت کی پوری نگرانی کر رہے تھے کہ اگر کوئی بات جادۂ حق سے منحرف واقع ہو تو خلافت کا تختہ الٹ کر رکھ دیں جیسا انجام کہ عثمان کا ہوا۔ جب اس نے مظالم شروع کر دیے

حالاں کہ لوگ زمانۂ عثمان میں بہ نسبت زمانہ شیخین کے کافی سست پڑ چکے تھے۔

ان باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخین ایک ایسے زمانہ میں تھے کہ جس میں قوانین سیاست میں اگر کوئی تغییر کرنا چاہتا تو مشکل تھا۔ اس لیے کہ نظر اسلامی ان کی باقاعدہ نگرانی کر رہی تھی۔ اور مسلمان اس وقت تک اسلام سے کافی خلوص رکھتے تھے۔ اور ان میں حکومت کا کافی شوق تھا۔ اور یہ بھی دیکھ رہے تھے کہ اگر اسلام میں کوئی واضح تغیر پیدا کر دیا تو حزب مخالف ہو کہ پیغمبری سانچے میں ڈھلا ہوا ہے اور جس کا داعی وارثِ رسولؐ وصی پیغمبرؐ ولی المومنین علیؑ ہے مقابلہ کے لیے کھڑا ہو جائے گا۔

اگرچہ فتوحاتِ اسلامیہ کو اس دور کے وقائع میں بطورِ سرخی نقل کیا جاتا ہے لیکن ہر شخص جانتا ہے کہ اس کو حکومتِ وقت سے کوئی تعلق نہیں اس لیے کہ ہر جنگ مجاہدینِ امت کی طبعی شرافتوں کا پتہ دیتی ہے اور میدانِ جہاد سے مجاہدین کی شخصیت کی تاریخ مرتب کی جاتی ہے نہ کہ اس حاکم کی کہ جس تک آتشِ جنگ کی چنگاری تک نہیں پہنچی اور جس کی کوئی مستقل رائے اس سلسلہ میں نہ تھی۔ اس لیے کہ خلیفۂ وقت نے خواہ جنگ شام میں ہو یا عراق میں یا مصر میں کسی وقت بھی کوئی کلمہ اپنی شخصی طاقت یا اپنی حکومت کے زور پر زبان سے نہیں نکالا کہ اس کلمہ کو اہمیت دی جا سکے۔ بلکہ بہتیرے کلماتِ رسالت کی قوت کا اعلان کیا۔ جس میں قطعی وعدہ تھا کہ بلاد کسریٰ و قیصر فتح ہوں گے۔ اس کلام نبی کریمؐ سے مسلمانوں کی امیدیں بڑھ گئیں اور ان میں جوش ایمانی پیدا ہو گیا۔

تاریخ یہ بھی بتاتی ہے کہ بہت سے وہ لوگ جو بعد رسول خانہ نشین ہو گئے تھے

وہ گھر سے نہیں نکلے جب تک یہ سن نہ لیا کہ پیغمبرؐ نے فتح بلاد کسریٰ و قیصر کی خبر دی ہے۔ بس یہی خبر رسولؐ اور قوت ایمانی تھی جو مسلمانوں کو میدانِ جنگ میں روکے ہوئے تھی۔

اس کے علاوہ ایک بات اور تھی جس نے مسلمانوں کو کامیاب بنایا اور اُن کو ہر معرکۂ جہاد میں مظفر و منصور قرار دیا جس کا کوئی تعلق حکومت شوریٰ وغیرہ سے نہیں ہے۔ اور وہ رسولؐ کا وہ اعلان توحید تھا جو آفاق میں گونج رہا تھا۔ مسلمان دیکھ رہے تھے کہ ہم جس ملک میں مادی قوت لیکر جاتے ہیں وہاں ایک روحانی لشکر بھی ساتھ ساتھ رہتا ہے۔ اور یہ بات ہمت افزائی کے لیے بہترین وسیلہ ہے۔

ان فتوحات میں حاکمین کا فریضہ یقینی یہ تھا کہ مسلمانوں کے ملک کو فتح کرنے کے بعد ان میں اسلامی روح پھونکیں۔ اُن کے سامنے قرآنی نمونے پیش کریں۔ ان کے دل کی گہرائیوں میں شعور دینی و مذہبی اتار دیں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ ان حکام نے اپنے اس فریضہ کو کس طرح انجام دیا۔ اب مورخین مجھے بتائیں کہ میں اس سلسلے میں کوئی منظر پیش کروں یا پھر بعض مورخین کی طرح پورا پورا شک کروں جیسا کہ تاریخ بھی گواہی دیتی ہے۔ (دونوں خلافتوں میں حالات ایسے تھے کہ نتیجہ خیز لشکری زندگی کی بنیاد ڈالتے اور سیاسی زندگی کی صحیح تعبیر کرتے)؟

پھر میں نہیں سمجھ سکتا کہ یہ لوگ کیا کرتے اگر علیؑ کی جگہ پر ہوتے اور علیؑ کو وہ دور مل جاتا جب کہ جملہ حالات نئی حکومت اور جدید سیاست تازہ زندگی اور لطف حیات کے لیے سازگار تھے۔ کیا یہ لوگ حالات کو اس طرح بدل سکتے تھے جیسے علیؑ نے زمانہ کو بدل کر اخلاص و عمل کی ایک مثال قائم کر دی۔

میں یہ نہیں کہتا کہ شیخین اچھی سیرت اختیار کرنے پر مجبور تھے اور اعتدالِ حکومت ان کے لیے اضطراری امر تھا۔ بلکہ میرا مقصد تو یہ ہے کہ حالات انھیں ان امور پر سختی سے آمادہ کر رہے تھے خواہ وہ خود راغب ہوں یا نہ ہوں میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ اُن کے نام کو تاریخ اسلامی سے علیحدہ کر دوں۔ بھلا یہ کیوں کر ہو سکتا ہے جب کہ سقیفہ میں اسلامی تاریخ کی بنیاد انھیں سے پڑی۔ میں تو صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اسلامی وقار دینی روحانیت جو کہ صدرِ اوّل میں تھی اس میں ان کا ہاتھ برائے نام تھا۔

عقاد کی کتاب "فاطمہؑ و فاطمیون" اور ہم

اس وقت میرے پیشِ نظر عباس محمود عقاد کی کتاب "فاطمہؑ و فاطمیون" ہے۔ میں نے اِس کتاب کو بڑے شوق سے کھولا ہے تاکہ اس موضوع پر اُن کی رائے کا مطالعہ کروں۔ اس وقت میرے ذہن میں یہ بات ہے کہ باپ دادا کی تقلید اور اُن کے غلط کارناموں کی تاویل کا زمانہ گزر گیا۔ اب وہ دور نہیں رہا جب مسائل انسانیت (خواہ وہ دینی ہوں یا تاریخی) میں غور و خوض کرنے سے پرہیز کیا جاتا تھا۔ اور شاید اس پرہیز کی ابتداء خلیفۂ اوّل سے ہوئی جب کہ ان سے مسئلہ قدر کے متعلق پوچھا گیا تو انھوں نے سائل کو تہدید و تخویف شروع کر دی۔ بنابریں میری دلی امید تھی کہ استاد موصوف کی کتاب سے اس بحث میں بہت کچھ لطیف مطالب حاصل ہوں گے لیکن افسوس کہ واقعہ اس کے خلاف نکلا۔ اور کتاب میں اس موضوع کے متعلق صرف چند سطریں نکلیں جن کو میں بعینہ نقل

کر سکتا ہوں جن کا ماحصل یہ ہے۔

"مسئلہ فدک کی بحث ان ابحاث میں سے ہے کہ جو کسی متفق علیہ نتیجہ تک نہیں پہنچ سکتی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ صدیقہؑ کسی ایسے امر کا مطالبہ نہیں کر سکتی جو اس کا حق نہ ہو اور صدیق بھی کسی کے حق کو نہیں روک سکتے اگر بیّنہ قائم ہو جائے یہ خیال انتہائی غیر مناسب ہے کہ ابوبکر نے فدک لے لیا تاکہ علیؑ اس کے حاصلات کو اپنی خلافت کے لیے نہ صرف کریں۔ اس لیے کہ ابوبکر و عمر و عثمان و علیؑ سب نے حکومت کی لیکن آج تک یہ نہیں سُنا گیا کہ کسی نے دولت دیکر بیعت حاصل کی ہو۔ اس امر کا ذکر کسی خبر و روایت میں نہیں مِلتا۔ میری نظر میں صدیق کے عہد میں فدک سے بہتر پاکیزہ فیصلہ کسی مقدمہ میں نہیں ہوا۔ اسلیے کہ وہ فاطمہؑ کو فدک دے کر خوش کر سکتے تھے اور انھیں کی رضا سے صحابہ بھی خوش ہو جاتے۔ چنانچہ انھوں نے فدک کا کوئی ذرہ اپنے لیے نہیں لیا بلکہ وہ تو فیصلہ کی ذمہ داری تھی جس کی بنا پر وہ اس قضیہ میں اس قدر مجبور ہو گئے ورنہ یہ سب صادق و مصدق رضوان اللہ علیہم اجمعین تھے"

ہم سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ استاد عقاد کی خواہش ہے کہ مسئلہ فدک کو اُن مسائل میں سے قرار دیں جنھیں کوئی قرار نہیں اور جن میں کوئی فیصلہ غیر ممکن ہے تاکہ بات کو تاہی بحث کا عذر بن سکے۔ اس کا جواب تو آئندہ معلوم ہو جائے گا اس وقت تو صرف یہ بتانا ہے کہ اگر بحث فدک کسی نتیجہ پر نہیں پہنچ سکتی تو پھر یہ دو ناقابلِ انکار حقیقتیں کہاں سے پیدا ہو گئیں۔ ایک یہ کہ صدیقہؑ ناحق مطالبہ نہ کریں گی اور دوسرے یہ کہ صدیق کسی کا حق نہ ماریں گے

اور اگر صحابہ کے کردار پر کوئی بحث نہیں ہو سکتی تو بے قرار بحث اور بے نتیجہ نزاع شروع سے کیوں اٹھائی گئی۔ میری رائے ہے کہ مصنف کو ہر موضوع میں اپنی آزاد رائے پیش کرنے کا حق ہے بشرطیکہ اس پر کوئی واقعی دلیل رکھتا ہو اور بحث کے جملہ شقوں پر حاوی ہو تاکہ کسی ایک شق کو اختیار کر سکے۔ لیکن اس کا کوئی مطلب نہیں ہے کہ مسئلہ کو محل بحث تو قرار دیا جائے لیکن جو رائے پیش کی جائے وہ دلیل سے بالکل بیگانہ ہو۔ جو خود ہی محتاج شرح و تفسیر اور غور و خوض ہو۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر فاطمہؑ ناحق مطالبہ نہ کریں گی تو پھر مطالبہ بینہ کیسا؟ کیا اسلامی قوانین قاضی کو اپنے علم کی بنا پر فیصلے سے روک دیتے ہیں؟

اگر ایسا ہے تو پھر کسی کے مال کا چھین لینا بھی اسلام میں اسی بنیاد پر جائز ہو جاتا ہے؟ یہ چند سوالات ہیں۔ اس کے علاوہ اور بھی سوالات ذہن میں پیدا ہوتے ہیں جو علمی جواب کے طالب ہیں۔ میں چونکہ حریت فکر کا قائل ہوں اس لیے میں استاد عقاد کو بتانا چاہتا ہوں کہ صدیق و صدیقہؑ دونوں کے کردار کی اصلاح غیر ممکن ہے اسلیے اگر یہ نزاع صرف اس بات پر ہوتی کہ صدیقہؑ باغ کا مطالبہ کریں اور صدیق منع کر دیں تو کہہ دیا جاتا کہ حقیقت میں فاطمہؑ صدیقہ ہیں لیکن مدرک شرعی کے مہیا نہ ہونے پر صدیق اُن کو فدک دینے سے مجبور ہو گئے۔ اس لیے کہ ممکن ہے کہ انسان کا واقعی حق نظام قضاوت کے قواعد کی بنا پر اسے نہ مل سکے۔ لیکن افسوس کہ بات صرف اتنی نہیں بلکہ خصومت نے مختلف شکلیں پیدا کیں۔ یہاں تک کہ صدیقہؑ نے صراحتاً ابوبکر کو متہم کیا اور ان سے بے تعلقی کا عہد کر لیا۔ اس وقت ہمارے سامنے دو باتیں ہیں۔ ایک یہ کہ ہم اعتراف کر لیں

کہ صدیقہؑ نے ایسے حق کا مطالبہ کیا کہ جو نظام شرعی اور قضاوت اسلامی کی رو سے انھیں نہ ملنا چاہیئے تھا اگرچہ واقعاً وہ انھیں کا تھا۔ دوسرے یہ کہ اس کی ذمہ داری ابوبکر پر ڈال دیں کہ انھوں نے فاطمہؑ کا واجب الادا حق نہیں دیا۔ (ان دونوں باتوں کا فرق آئندہ واضح ہوگا) پس یہ کہنا کہ فاطمہؑ حدود شرع کے خلاف مطالبہ نہ کریں گی اور ابوبکر کسی کا حق نہ ماریں گے ناقابل اجتماع باتیں ہیں جب تک کہ اجتماع ضدین ممکن نہ ہو جائے۔

یہاں پر ایک دوسرا اعتراض یہ پیدا ہوتا ہے کہ استاد عقاد نے فاطمہؑ کے خلاف فیصلہ کو خلیفہ کے خلاف ثبات قدم اور عدالت و استقامت کی دلیل قرار دیا ہے اس لیے کہ اگر وہ فدک فاطمہؑ کو دے دیتے تو وہ بھی خوش ہو جاتیں اور صحابہ بھی خوش ہو جاتے۔ ہم نے مانا کہ حدود قانون اسلامی فدک کو صدقہ قرار دینے پر مجبور کرتے تھے تو کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ اپنے اور اصحاب کے حصہ سے کچھ بنتِ رسولؐ کو دے دیا جاتا۔ جب کہ صحابہ اس سے خوش تھے۔ بقول عقاد:۔

کیا قانون اسلام میں یہ بھی حرام تھا؟

یا کسی کا اشارہ تھا کہ فاطمہؑ کی اولاد بھوکی رہے؟ بلکہ وہ کون سا قانون تھا جو فدک دینے سے مانع تھا جب کہ فاطمہؑ نے وعدہ کر لیا تھا کہ اس کے حاصلات کو مصالح مسلمین ہی پر صرف کریں گی۔ رہ گیا یہ مسئلہ اگر فدک علیؑ کو ملتا تو وہ اس سے حکومت چلاتے جس کو عقاد نے وہم و خیال تصور کیا ہے تو اس کا تجزیہ ہم بعد میں کریں گے کہ آیا یہ خیال کہاں تک صحیح ہے؟

طرفین کے موقف کی احساسی توجیہ و تعلیل؟

جب یہ معلوم ہو گیا کہ لوگوں کے ذاتی عقائد آسمانی وحی نہیں ہیں کہ جو ناقابل شک و انکار ہوں۔ اور اسلاف کے کارناموں کی تنقید کفر و الحاد نہیں ہے جیسا کہ ایک جماعت کا خیال ہے تو پھر ہمیں پوچھنے کا حق ہے کہ فاطمہؑ کو کس شے نے آمادہ کیا تھا کہ ایسی سختی کے ساتھ فدک کا مطالبہ کریں کہ گویا حکومت وقت اور سلطنت حاضرہ کی جلالت آپ کی نظر میں کچھ ہے ہی نہیں کہ جو اس کے مظالم کی پردہ پوشی کرے۔ بلکہ فیصلہ اتنا نمایاں ہو جائے کہ کوئی پردہ اس کو چھپا نہ سکے۔

بلکہ اس نزاع کی ابتداء اور اس کے مراحل تو یہ بتلاتے ہیں کہ یہ نزاع آخر تک پہنچتے پہنچتے ایک انقلاب کی شکل اختیار کرے گی جس میں کسی ضعف و تردد کی گنجائش نہ ہوگی۔

عجیب نہیں کہ حکومت وقت بلکہ خود خلیفہ کا یہ مقصد رہا ہو کہ فاطمہؑ زہرا کے ساتھ دو رنگی چال چلی جائے۔ لیکن یہ ان کے دل میں نہ آیا کہ اس طرح تاریخ میں ان کی بدعتوں کا ایک باب تیار ہو جائے گا۔ جس میں ان کے اور اہلبیت رسالت کے جھگڑے نقل کیے جائیں گے۔ تو پھر خلیفہ وقت اس تاریخی باب کے موافق تھے کہ وہ فاطمہؑ کے خلاف اس جرأت و ہمت کا مظاہرہ کر رہے تھے یا وہ واقعاً قوانینِ قضاوت کے پابند تھے اور حدود الٰہیہ سے تجاوز جائز نہ جانتے تھے جیسا کہ بعض کا خیال ہے یا اس موقف عجیب کو موقف سقیفہ سے بھی کوئی ارتباط حاصل ہے۔ اور وہ ارتباط اتحاد غرض کی بنا پر ہے یا دو غرضوں کا ایک دائرہ پر جمع ہونے کی وجہ سے ہے

جس دائرہ کی وسعت حکومت نبی اکرمؐ کے برابر ہے جس میں خلیفہ کے لیے بڑی امیدیں تھیں جن کو دیکھ کر وہ مسکرا دیا کرتے تھے۔ یہ بات واضح ہے اور حرکت فاطمیہ کا دور یہ بتاتا ہے کہ وہ اہلبیت کہ جو اپنے عمید اکبر کے انتقال سے محزون و رنجیدہ تھے، حالات سے اس قدر متاثر ہو گئے تھے کہ وہ حالات حاضرہ کو بدلنے اور اُن کو نئے سانچے میں ڈھالنے کی اشد ضرورت محسوس کر رہے تھے۔ اور اتفاقاً فاطمہؑ زہرا کے لیے انقلاب کے جملہ امکانات اور مقابلہ کی تمام قوتیں مہیا ہو گئی تھیں۔

جب ہم تاریخی وقائع کا بغور مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ یہ نزاع اپنے واقع کے اعتبار سے حکومت وقت کے خلاف ایک انقلاب کی کوشش تھی۔ چونکہ اس نے اصولِ شریعت بدل کے رکھ دیے تھے اس کا حقیقی تعلق ایک مالی سیاست سے نہیں ہے اگرچہ اُس انقلاب کی ابتداء اقتصادی مسئلہ ہی سے ہوئی تھی۔ صرف یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ دنیا حکومتِ وقت کی دین نبی کریمؐ سے بے تعلقی کا بغور مطالعہ کر لے۔

اگر ہم چاہتے ہیں کہ انقلاب فاطمی کی اصل معلوم کریں تو ہمارا فرض اولین ہے کہ واقعہ کا بغور مطالعہ کریں تاکہ ہمیں تاریخ اسلام کے دو واقعے جو ایک دوسرے کا عکس اور اثر تھے واضح ہو جائیں۔ ان دونوں وقائع کا رشتہ درحقیقت ایک تھا جو کہ تھوڑے فاصلے سے متحد ہو جاتا تھا۔

اُن وقائع میں سے ایک فاطمی اقدام تھا کہ جس کی اہمیت نے قریب تھا کہ ارکانِ حکومت کو متزلزل کر دے اور خلافت اولیٰ کو تاریخ میں مہملات کی جگہ دے دے۔ اور دوسرا عائشہ کا اقدام جس نے یہ چاہا تھا کہ زوج بتول علیؑ ابن ابی طالب کی حکومت کی بنیاد ہلا دے۔ مقدر ایسا تھا کہ دونوں اقدامات ناکام ہوں۔ لیکن ناکامیوں میں ذرا سا فرق

تھا جو اقدام کرنے والے کی طبعی رضامندی سے وابستہ تھا اور اس کے اطمینان نفس اور انتصار حق کا پتہ دے رہا تھا۔ فاطمہؑ ناکام ہوئیں۔ لیکن اس عالم میں کہ خلیفہ رو رو کر کہہ رہے تھے کہ مجھے خلافت سے مستعفی کرو۔ اور عائشہ ناکام ہوئیں اس عالم میں کہ وہ تمنا کرتی تھیں کاش گھر سے باہر نہ نکلتی اور مسلمانوں میں افتراق نہ پیدا کرتی۔ یہ دونوں وہ انقلابات ہیں جو موضوع اور شخص کے اعتبار سے بہت قریب قریب ہیں تو پھر ایسا کیوں نہیں ہے کہ ان کے محرکات اور اسباب بھی ایک جیسے ہوں۔

ہم بخوبی واقف ہیں کہ وہ سبب انقلاب جس نے عائشہ کو گھر سے نکال دیا اس وقت جب کہ انھوں نے خلافتِ علیؑ کی خبر پائی آن اوقات میں پیدا ہوا تھا جب حیات نبی کریمؐ میں زوجہ رسولؐ اور بنت رسولؐ کے مقابلے چل رہے تھے۔

اس مقابلہ کا انجام یہی ہونا تھا کہ اس میں وسعت پیدا ہو اور طرفین کے دلوں میں غیظ و نفرت کے احساسات پیدا ہوں۔ اور پھر طرفین کے کچھ اعوان و انصار بھی ہو جائیں یہاں تک کہ ایک مرتبہ اس دائرہ میں وسعت پیدا ہو گئی۔ ایک طرف اس طرح کہ عائشہ نے علیؑ کے خلاف انقلاب کی مہم چلادی۔ دوسری مرتبہ اس کا بالکل عکس دوسری طرف وسعت پیدا ہوئی جس کے نتیجہ میں اس شخصیت کو بھی لے لیا جس کی وجہ سے بیت النبیؐ میں علیؑ سے عداوت چل رہی تھی۔

صحیح تو یہ ہے کہ عائشہ کے انقلاب کی مہم اس وقت سے شروع ہو گئی تھی جب قصہ افک میں علیؑ نے پیغمبرؐ کو طلاق کا مشورہ دیا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ بات ایک عورت کو کس قدر متاثر کر سکتی ہے جب کہ وہ پہلے سے اس کی زوجہ کی مخالف بھی ہو۔ نتیجہ یہ ہوا کہ زوجۂ رسولؐ اور بضعۃ النبیؐ کے درمیان تنازع اس حد تک بڑھی

کہ اس میں علیؑ و غیر علیؑ کو بھی داخل کر لیا گیا۔

ان وقائع سے معلوم ہوتا ہے کہ حالات خلیفۂ اوّل کو فاطمہؑ کی خاص نگرانی کی طرف متوجہ کر رہے تھے۔ مزید برآں یہ کہ جب خلیفۂ اوّل نے فاطمہؑ سے عقد کا پیغام دیا تھا تو اسے پیغمبرؐ نے رد کر دیا تھا۔ اور علی کے پیغام کو قبول کر لیا۔ ظاہر ہے کہ یہ رد و قبول بھی ایک ایسے انسان میں کہ جس کے پہلو میں دل ہو اور دل میں احساس ایک غیظ یا حسد کا مادہ ضرور پیدا کر دے گا۔ اس طرح دونوں امیدواروں میں ایک مقابلہ کا جذبہ پیدا ہو جائے گا۔

یہ بھی قابلِ توجہ امر ہے کہ رسولؐ نے ابوبکر کو سورۂ برأت دیکر بھیجا تاکہ کفار کو سنائیں اور اس کے بعد علیؑ کو بھیج کر نصف راہ سے واپس لے لیا۔ صرف اس بنا پر کہ فاطمہؑ کے بارے میں علیؑ سے مقابلہ کرنے والا اپنی استعداد ایمانی کا اندازہ کر لے۔

یہ بھی طبعی بات ہے کہ خلیفہ اس مقابلہ کو دیکھ کر بھی متاثر ہو رہے ہوں گے کہ جو فاطمہؑ اور عائشہ کے درمیان پیغمبر اکرمؐ کی محبت کے سلسلے میں چل رہا تھا۔ جیسا کہ ایک باپ کا بیٹی کے متعلق خیال ہوتا ہے۔ اور عجب نہیں کہ جس وقت مرض الموت نبی اکرمؐ میں عائشہ نے اپنے باپ کو نماز کے لئے بھیج دیا اور پھر خود پیغمبرؐ نے آکر ان کو معزول کر دیا۔ خلیفہ نے یہ خیال کیا ہو کہ یہ تحریک بھی فاطمہؑ کی ہے۔ انھوں نے میری امامت کو باطل کرنے کے لیے اپنے باپ کو بستر علالت سے اٹھا کر مسجد روانہ کر دیا؟

تاریخ سے یہ قطعی امید نہیں ہو سکتی کہ وہ وقائع کو مفصل و مشرح بیان کرے البتہ جو بات کہ یقینی معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ جس شخص پر ایسے ناکام حالات گزر چکے ہوں اس کا فطری تقاضہ یہ ہے کہ فدک میں فاطمہؑ کے مقابلہ میں سختی سے قیام کرے

اور وہ عورت جو فاطمۂ زہراؑ کی طرح سے مصائب اٹھائے یہاں تک کہ صبح و شام مخالف کی بیٹی کے حسد سے نجات نہ پا سکے یقیناً اس امر کی مستحق ہے کہ وہ اس وقت خاموش نہ رہے کہ جب لوگ اس کے حق شرعی پر قابض ہو رہے ہوں۔

انقلاب کا سیاسی رنگ

یہ ہے تاریخ انقلاب فاطمی جس میں مختلف پہلو سامنے نظر آتے ہیں جن میں واضح تر پہلو سیاست کا ہے۔ جس کا اندازہ اطوار و اسالیب انقلاب سے ہوتا ہے۔

اس بات سے میری مراد وہ مفہوم نہیں ہے جو آج کل رائج ہے جس کی بنیاد جعل و فریب پر ہوتی ہے بلکہ میرا مقصود وہ حقیقی مفہوم ہے جس میں افترا کی گنجائش نہیں ہے۔ لہٰذا اگر کوئی شخص اس نزاع کے اشکال و اطوار کا مطالعہ کرے تو فوراً یہ خیال کرے گا کہ اتنا بڑا اقدام ایک زمین کے مطالبہ کے لیے نہیں ہو سکتا۔ بلکہ درپردہ کوئی اس سے بڑی مہم ہے جو انقلاب پر آمادہ کر رہی ہے اور عورت کو مجبور کر رہی ہے کہ وہ اپنی گئی ہوئی حکومت اور لٹے ہوئے تخت و تاج کو واپس لے لے۔

بنا بریں فدک ایک رمزی لفظ ہے جس سے بڑے اہم معنی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اور اس سے مراد حجاز کا خطۂ ارضی نہیں ہے۔ اور یہی فدک کی رمزیت تھی جس کا دائرہ وسیع ہوتا گیا یہاں تک کہ وسیع میدانِ جنگ قائم ہو گیا۔ آپ جس طرح چاہیں تاریخ فدک کے حقائق کا مطالعہ کریں لیکن مجھے بتا دیں

کیا یہ ایک مادی جھگڑا تھا؟ کیا یہ فدک کے محدود معنی میں نزاع ہو رہی تھی؟ کیا یہ ایک مختصر زمین کے غلات کا مقابلہ تھا؟ ہرگز نہیں۔ طرفین نزاع کی شان اس سے اجل و ارفع ہے کہ ایسی نزاع قائم کریں۔ بلکہ درحقیقت یہ اقدام اساس حکومت کے خلاف تھا جس سے فاطمہؑ نے چاہا تھا کہ خلافت کی ان بنیادوں کو ہلا کر پھینک دیں جو ان کے شوہر کے خلاف روز سقیفہ قائم کی گئی تھیں۔

اس امر کے اثبات کے لیے وہ خطبہ کافی ہے جو کہ فاطمۂ زہراؑ نے مسجد رسولؐ میں خلیفہ کے سامنے پڑھا تھا جس وقت مسجد انصار و مہاجرین سے چھلک رہی تھی۔ جس میں پہلے زہراؑ نے علیؑ کی مدح کی اور ان کی جنگوں کا تذکرہ کیا۔ حقوق اہلبیتؑ رسالت بیان کیے کہ یہی مخلوقات کا وسیلہ ہیں۔ یہی حجج اللہ اور وارث انبیاء ہیں۔ اس طرح فاطمہؑ نے لوگوں کو ان کی خطا ان کے فوری انتخاب کی کمزوری اور ان کو ان کی بے دینی کی طرف متوجہ کر دیا۔ اور وہ اسباب بیان کر دیے کہ جن کی وجہ سے امت نے موضوع خلافت و امامت میں کتاب و سنت کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ اب معلوم ہو گیا کہ مسئلہ مسئلہ میراث و عطیہ نہیں ہے مگر اس مقدار تک کہ جہاں تک اس کا تعلق حکومت وقت سے ہے اور یہ مطالبہ کسی جائداد کا نہیں ہے بلکہ زہراؑ کی نگاہ میں یہ اسلام و کفر، ایمان و نفاق اور نص و اجماع کا مسئلہ ہے۔

یہی بلند سیاست اس گفتگو میں بھی نظر آتی ہے جو فاطمہؑ نے انصار و مہاجرین کی عورتوں سے کی تھی۔ آپ نے فرمایا کہ "لوگوں نے ارکان رسالت

قواعدِ نبوت، مالک دنیا و دین کو چھوڑ کر خلافت نہ جانے کن لوگوں میں ڈال دی۔ بھلا کون سا عیب علیؑ میں انھوں نے پایا۔ ہاں! یہ علیؑ کی تلوار، ان کے اقدامات، ان کے مجاہدات اور راہِ خدا میں اُن کی قربانیوں سے نالاں ہیں" اس کے بعد فرماتی ہیں" ان لوگوں نے پست اقوام کو بلند لوگوں پر مقدم کر دیا ہے اور یہ خیال کرتے ہیں کہ ان کا یہ عمل اچھا ہے۔ یاد رکھو! یہ لوگ فساد برپا کرتے ہیں اور انھیں خود شعور نہیں ہوتا۔ حیف۔ یہ اتنا بھی نہیں سوچتے کہ ہدایت یافتہ انسان زیادہ مستحق اتباع ہوتا ہے یا وہ شخص جو خود ہی محتاجِ ہدایت ہو۔ نہایت ہی بدترین یہ فیصلہ ہے"

ازواجِ رسولؐ سے کہیں نقل کیا گیا کہ انھوں نے بھی میراث کا مطالبہ کیا تھا۔ کیا یہ کہا جائے یہ عورتیں فاطمہؑ زہرا سے زیادہ زاہدہ تھیں؟ یا یہ تصور کیا جائے کہ مذاقِ شریعت رسولؐ سے زیادہ واقف تھیں یا یہ تصور کیا جائے کہ یہ مصیبتِ پیغمبرؐ میں مشغول ہو گئیں اور فاطمہؑ متوجہ نہیں ہوئیں۔ یا پھر یہ مان لیا جائے کہ حکومتِ وقت نے حالات میں تفرقہ پیدا کر دیا۔ انھوں نے ازواج کو مطالبہ کا موقع ہی نہیں دیا۔ اور فاطمہؑ کو اس امر پر مجبور کر دیا کہ وہ شدید معارضہ اور سخت مقابلہ کریں جو تاریخ میں ابدی یادگار بن جائے۔

میرا قوی خیال ہے کہ فاطمہؑ کی نظر میں شیعیان حیدرِ کرار اور اصحابِ علیؑ میں ایسے افراد ضرور رہے ہوں گے جو فاطمہؑ کو سچا سمجھتے تھے۔ اور ان کے ذریعے سے فاطمہؑ نصاب شہادت کامل کر سکتی تھیں۔ لیکن فاطمہؑ کا یہ نہ کرنا بتاتا ہے کہ اُن کا مقصد اثباتِ میراث و عطیہ نہ تھا بلکہ نتائجِ سقیفہ کے خلاف اقدام تھا۔ اور وہ فدک میں اقامہ شاہدین سے نہیں ہو سکتا بلکہ اس امر پر شاہد جمع کرنے سے

ہو گا کہ یہ لوگ حقیقی صراطِ مستقیم سے گمراہ ہو گئے ہیں اور یہی وہ باتیں تھیں جنھیں فاطمہؑ زہرا نے اپنے اقوال و افعال سے نمایاں کر دیا۔

آئیے اب اس کے بعد خلیفہ کے کلمات سنیں۔ جب فاطمہؑ زہرا مسجد سے واپس چلی گئیں تو خلیفہ نے منبر پر جا کر یوں خطاب کیا: "اے لوگو! تمھیں کیا ہو گیا ہے کہ ہر بات سن لیتے ہو۔ انھیں تو یہ امیدیں عہدِ رسولؐ ہی سے تھیں جس نے سنا ہے وہ کہے، جو جانتا ہو وہ بولے، سچ تو یہ ہے کہ وہ (علیؑ) ایک لومڑی کے مانند ہے جس کی گواہ اس کی دُم ہو۔ وہ فتنوں کی آماجگاہ ہے۔ اس کی مثال ام طحال کی ہے جسے صرف اپنی بیٹی سے محبت ہوتی ہے۔ یاد رکھو میں اگر چاہوں تو کہہ سکتا ہوں اور اگر کہوں گا تو کھل کر کہوں گا لیکن اس وقت مناسب نہیں ہے" پھر انصار سے متوجہ ہو کر کہا: "اے گروہ انصار! مجھے تمھارے بیوقوفوں کے کلمات کی اطلاع ملی ہے۔ تم عہدِ رسولؐ کی پابندی کے زیادہ حقدار تھے لیکن جب وہ تمھارے پاس آئے تو تم نے انھیں پناہ دی اور ان کی نصرت کی۔ یاد رکھو میں کسی غیر مستحق کو سزا دینا نہیں چاہتا"

اس کلام نے خلیفہ کی شخصیت کا مافی الضمیر اندازہ ہوتا ہے اور فاطمی نزاع پر کچھ روشنی پڑتی ہے۔ اس وقت جو بات زیادہ اہم ہے وہ یہ کہ خلیفہ نے بھی فاطمی مطالبہ سے یہ اندازہ کر لیا تھا کہ صرف میراث و عطیہ کا مطالبہ نہیں ہے اسی لیے انھوں نے روئے سخن علیؑ کی طرف موڑ دیا۔ اور انھیں کی مذمت شروع کر دی۔ میراث کا کوئی تذکرہ نہیں کیا۔ یہ باتیں اس امر پر دال ہیں کہ فاطمہؑ کا اقدام اس حق کے مطالبہ کے لیے تھا جو اُن کے شوہر کو آسمان سے حاصل ہوا تھا۔ جس کے وہ ذاتی اہل تھے۔

اس کے علاوہ وہ روایت بھی قابل دید ہے جو صحاح اہلسنت میں موجود ہے کہ علیؑ وعباس میں عمر کے زمانہ میں فدک کے بارے میں جھگڑا ہوا۔ علیؑ کا دعویٰ تھا کہ رسولؐ نے فاطمہؑ کو ہبہ کر دیا تھا اور عباس اس کے منکر تھے۔ اُن کا دعویٰ تھا کہ ملک رسولؐ ہے اور میں اس کا وارث ہوں۔ عمر کے پاس معاملہ پیش ہوا اور انھوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ اپنے حالات تم بہتر سمجھتے ہو۔ میں نے تم دونوں کے حوالے کر دیا۔

اگر یہ حدیث صحیح ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ خلیفہ اوّل کا حکم صرف وقتی سیاست کی بنا پر تھا۔ ورنہ عمر بن الخطاب ان کی بیان کردہ حدیث پر ضرور عمل کرتے۔ اور حالات یہ بتلاتے ہیں کہ عمر نے دونوں کو فدک بطور میراث دیا تھا۔ نہ بطور وکالت ورنہ اگر ایسا ہوتا تو عمر کو بھی یہ فیصلہ کرنا چاہیئے کہ تم دونوں وکیل ہو یہ نزاع بالکل بیکار ہے۔ مزید برآں یہ کہ تنہا علیؑ کو نہ دینا بتاتا ہے کہ عمر کو دعویٰ عطیہ کا بھی اعتبار نہ تھا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ فدک دونوں کو بطور میراث دیا گیا تھا اور بس!

اب اس مسئلہ کی دو صورتیں ہو گئیں (۱) عمر خلیفہ اوّل کو واضع حدیث سمجھتا تھا (۲) عمر حدیث کے ایسے معنی سمجھے ہو کہ منافی وراثت نہ تھے۔ لیکن انھوں نے اسے بیان نہیں کیا۔ اب چاہے یہ احتمال صحیح ہو یا وہ لیکن سیاسی پہلو بالکل آشکار ہے۔ ورنہ اگر مسئلہ سیاست وقت کے اعتبار سے حل نہ کیا جاتا تو عمرؓ ابوبکر کو واضع حدیث کہتے یا تاویل کو مخفی نہ کرتے جبکہ انھوں نے اکثر مسائل میں رسولؐ اسلام اور ابوبکر کے

روبرو ان کی تردید کی ہے۔

جب ہمیں یہ معلوم ہو گیا کہ فاطمہؑ کا مطالبہ اس وقت شروع ہوا جب لوگ حکومت اسلامی کو غصب کر چکے تھے حالاں کہ کسی شخص نے اپنی میراث خلیفہ سے طلب نہیں کی۔ تو واضح ہو گیا کہ مطالبہ میراث ایک بہانہ تھا اس اقدام کی ابتدا کا جو فاطمہؑ زہرا غاصبین خلافت نبی اکرمؐ کے خلاف کرنا چاہتی تھیں۔ اور جس سے اپنے شوہر کے حقوق کا تحفظ کرنا چاہتی تھیں۔

(اقول) جب کہ یہ واضح ہو گیا کہ فاطمہؑ نے اپنے حق کا مطالبہ غصب سے پہلے نہیں کیا تو معلوم ہو گیا کہ حالات زمانہ فاطمہؑ کی پوری پوری حمایت کر رہے تھے کہ قضیہ میراث کو بہانہ قرار دیکر اُٹھ کھڑی ہوں اور امت کے سامنے ثابت کر دیں کہ وہ لوگ ہرگز مستحق خلافت نہیں ہو سکتے جو بنت رسولؐ کا حق غصب کر لیں اور قوانین شریعت کا استخفاف کریں۔ فاطمہؑ ایسا نہ کرتیں تو آج حق و باطل کا امتیاز مٹ کر رہ جاتا۔

حکومت میں جماعتی رنگ آمیزی

اگر ہم چاہیں کہ اس نزاع کا مطالعہ اُن حالات کی روشنی میں کریں جن میں یہ نزاع قائم ہوئی تو ضرورت اس امر کی ہوگی کہ مختصر طریقے سے اس عہد انقلابی کی تصویر کشی بھی کر دیں تاکہ اپنے موضوع سے خارج نہ ہونے پائیں۔ ہماری مراد اس انقلاب سے اس کے معنی حقیقی ہیں۔ چونکہ اس عہد میں قانون اسلام منقلب ہو گیا تھا اور بجائے ملوکیت ایسی جمہوریت قائم ہو گئی تھی جس کے ا

تمام اختیارات اور صلاحیات عوام الناس کے ہاتھوں میں تھے جبکہ پیغمبر کی استعداد ممنون احسان سماوی تھی۔

جس وقت کہ بشیر بن سعد نے خلیفہ کے ہاتھ پہ ہاتھ مارا اس وقت سے تاریخ اسلامی میں ایک نئے دور کا آغاز ہوگیا اور اس دورِ جدید کے درمیان جس کا اب آغاز ہو رہا ہے۔ یہ حادثہ اس دن پیش آیا جب حیات نبوت کی آخری ساعت ختم ہو رہی تھی اور زمین و آسمان کے مقدس اور بابرکت رشتے منقطع ہو رہے تھے۔ جس وقت پیغمبر کی آخری سانسیں ختم ہوئیں اور آن کی روح اقدس ملاء اعلیٰ کی طرف پرواز کر کے قاب قوسین اوادنیٰ کی منزلوں میں پہنچ گئی۔ لوگ اس بیت النبوۃ کی طرف متوجہ ہوئے کہ جس سے محمدی شعاعیں نکل رہی تھیں تاکہ عہد رسالت کو رخصت کریں، اس نبوت کی تشیع کریں جو کلید مجد امت اسلامیہ اور سر عظمت دین اسلام تھی۔ لوگ بیت رسالت کی طرف اس عالم میں چلے کہ آن کے دلوں میں مختلف خیالات متفرق احساسات تھے۔ آن کے افکار پر پیغمبر کے تذکرے چھائے ہوئے تھے۔ جلالت رسالت کا پہرہ تھا۔ وہ یہ خیال کر رہے تھے کہ یہ دس سال جو نبوت کے سایہ رحمت میں گزارے ہیں شاید ایک خواب تھا جو چند لمحلوں تک قائم رہا۔ اور اس سے انسان اس عالم میں بیدار ہوا کہ چاروں طرف سے مصائب میں گھرا ہوا ہو۔ مسلمان اس بے پناہ شدت اور ہولناک خاموشی کے عالم میں تھے کہ کسی کی زبان سے کوئی کلمہ نہ نکلتا تھا بلکہ ہر شخص اپنے آنسوؤں اور حسرتوں سے بیت رسالت کو پُر سا دے رہا تھا کہ ایک دفعہ ایک آواز سنائی دی جس نے فضاؤں میں ہلچل ڈال دی اور خاموشی کا سلسلہ منقطع کر دیا۔ وہ آواز یہ تھی کہ محمدؐ

کا انتقال نہیں ہوا۔ اور جب تک دین اسلام عالم پر غالب نہ آجائے وہ نہیں مر سکتے۔ عنقریب پلٹ کر آئیں گے اور جس نے آن کی موت کا اعلان کیا ہے اس کے ہاتھ پیر کاٹ ڈالیں گے میں جسے یہ کہتا سنوں گا کہ محمدؐ مر گئے اس کی گردن اڑا دوں گا۔ ساری نظریں مصدر صوت کی طرف متوجہ ہوگئیں تاکہ دیکھیں کہ آخر قائل کون ہے دفعتاً دیکھا کہ عمر ابن الخطاب خطبہ دے رہے ہیں اور آن کی رائے میں اتنی شدت ہے کہ جو کسی تذبذب کے قابل نہیں۔ اب لوگوں میں خبر حیات النبیؐ دوبارہ نشر ہوگئی اور اس موضوع پر چہ میگوئیاں شروع ہوگئیں۔

میرا خیال ہے کہ یہ رائے اکثر لوگوں کی نظر میں عجیب و غریب معلوم ہوئی ہوگی بلکہ بعض لوگوں نے تکذیب کا قصد بھی کیا ہوگا لیکن قائل کا اپنے قول پہ اٹل رہنا اس بات سے مانع ہوگیا اور لوگوں نے جمع ہو کر اس قول پہ تبصرہ شروع کر دیا ہوگا یہاں تک کہ ابوبکر آگئے جو کہ اس وقت اپنے مکان قریہ سنخ میں تھے انھوں نے آتے ہی کہہ دیا ایہا الناس! جو محمدؐ کی عبادت کرتا تھا وہ سمجھ لے کہ محمدؐ مر گئے اور جو اللہ کا بندہ تھا اس کا خدا زندہ ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ پیغمبرؐ تمھیں بھی ایک دن مرنا ہے۔ اگر پیغمبرؐ دنیا سے اٹھ گیا تو کیا تم لوگ کافر ہو جاؤ گے۔ ادھر عمر نے یہ آواز سنی اور انھیں وفات پیغمبرؐ کا یقین ہو گیا وہ کہنے لگے میں نے پہلے آیت سنی ہی نہ تھی۔

میری نظر میں وہ لوگ کہ جو اس واقعہ کو ابوبکر کی شجاعت اور ان کی شوکت خلافت کی دلیل سمجھتے ہیں قطعاً خطا پر ہیں اس لیے کہ عمر کو ٹوک دینا کوئی بڑی بات نہ تھی جب کہ تاریخ شاہد ہے کہ اس وہم میں عمر کا کوئی شریک نہ تھا بلکہ

یہ اُن کی ذاتی رائے تھی۔

اس بحث کا فریضہ یہ ہے کہ میں اس بات کی تحقیق کروں کہ خلیفہ وقت کا وہ خطاب جو لوگوں کے سامنے پیش کیا گیا وہ ایک بے ربط کلام تھا جس کو مسلمانوں کے تڑپتے ہوئے احساسات سے کوئی لگاؤ نہ تھا بلکہ انھوں نے بیان حادثہ میں اس سے زیادہ تو کچھ نہیں کہا کہ محمدؐ کے عابد سمجھ لیں کہ محمدؐ مر گئے حالانکہ ایسے موقع پر ابوبکر سے یہ امید تھی کہ وہ مرنے والے کا پرسہ دیں گے اور اُن جذبات و حسرات کا خیال کریں گے کہ جو مسلمانوں کے دلوں میں بھڑک رہے ہیں۔

بھلا وہ کون سا انسان تھا کہ جو سید الانبیاء کی عبادت کرتا تھا کہ جس سے کہا جائے کہ تمہارا معبود مرگیا۔ کیا کلام عمر کے کسی لفظ سے یہ خیال کیا گیا کہ وہ عابد محمدؐ تھے؟ یا ارتداد و الحاد کی لہریں اس اجتماع مومنین میں دوڑ رہی تھیں کہ جو چند ساعت قبل تک رسولؐ کے سایۂ رحمت میں پرورش پا رہا تھا۔ اور جس کے آنسو وفات پیغمبرؐ پر مسلسل بہہ رہے تھے۔

اب واضح ہوگیا کہ ابوبکر کے خطاب کو نزاکت وقت اور اعلانِ عمر سے کوئی لگاؤ نہ تھا اور نہ اسے جذباتِ اسلامی سے کوئی تعلق تھا۔ اسی اجتماع کے مقابلہ میں ایک دوسرا اجتماع انصار کا سقیفہ بنی ساعدہ میں ہوا جس کی ریاست رئیس خزرج سعد بن عبادہ کے ہاتھ میں تھی۔ وہاں لوگوں کو حکومت اسلامی قائم کرنے کے لیے بلایا گیا۔ اور یہ بحث شروع ہوگئی کہ اگر مہاجرین نے انکار کر دیا تو کیا ہوگا۔ اور اپنی قرابت کا واسطہ دیا تو ہم کیا کریں گے۔ ایک شخص بول اٹھا ایک امیر ہم میں سے ہو جائے گا ایک اُن میں سے۔ سعد نے کہا یہ پہلی کمزوری ہے۔ جب عمر

کو خبر ملی تو خانۂ رسولِ اکرمؐ تک آئے جہاں ابوبکر تھے۔ آدمی بھیج کر انھیں بلایا۔ انھوں نے عذر کیا۔ دوبارہ طلب کیا اور واقعہ کی اہمیت کا واسطہ دیا۔ وہ نکلے تو انھیں اطلاع دی۔ اور دونوں دوڑتے ہوئے سقیفہ کی طرف چلے۔ اُن کے ساتھ ابوعبیدہ بھی تھے۔ ابوبکر نے پہنچتے ہی مہاجرین کی قرابت کا ذکر شروع کر دیا اور بولے کہ ہم امیر اور تم وزیر ہو۔ تم سے رائے مشورہ کرتے رہیں گے۔ حباب بن منذر نے کھڑے ہو کر کہا اے انصار! اپنے امیر کی حفاظت کرو۔ لوگ تمھارے زیرِ سایہ عطوفت ہیں۔ کسی میں تمھاری مخالفت کی جرأت نہیں ہے۔ تم اہل عزت و شرافت و عدد و کثرت ہو تم صاحب رعب و کرامت ہو۔ اگر یہ نہ مانیں تو ہم میں سے بھی امیر ہو اور اُن میں سے بھی۔ عمر بول اٹھا ایک نیام میں دو تلواریں نہیں ہو سکتیں۔ عرب اس امر سے خوش نہیں کہ تم کو امیر مانے۔ جب کہ رسولؐ تم میں سے نہیں۔ لیکن عرب ہمیں امیر مان لے گا چونکہ ہم اقرباء اور اولیاء رسولؐ اکرم ہیں۔ حباب نے دوبارہ تاکید کی۔ اپنے ہاتھوں کو قابو میں رکھو ایسی باتیں مت سنو ورنہ تمھارا حق ضائع ہو جائے گا۔ تمھاری تلواروں سے دین کی بنیادیں مستحکم ہوئیں۔ میں ان باتوں کو خوب سمجھتا ہوں۔ تم اگر میرا ساتھ دو تو تمام کام درست ہو جائے۔ عمر نے کہا اللہ تجھے ہلاک کر دے گا۔ وہ بولا تجھے قتل کر دے گا۔ ابوعبیدہ نے کہا گروہ انصار تم نے شروع سے پیغمبر کی مدد کی اب چاہتے ہو کہ دینِ نبیؐ میں تغیر پیدا کر دو۔ بشیر بن سعد کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا اے انصار محمدؐ قریش سے ہیں اور وہ زیادہ مستحق ہیں۔ میں اس امر میں نزاع نہیں کر سکتا۔ ابوبکر نے کہا۔ یہ عمر اور ابوعبیدہ ہیں کسی ایک کی بیعت کرلو وہ دونوں بولے ہم اس کے اہل نہیں۔ آپ افضل المہاجرین اور نماز میں خلیفۂ رسولؐ ہیں آپ ہاتھ پھیلائیے۔ انھوں نے ہاتھ بڑھایا بشیر بن سعد نے

بڑھ کر بیعت کر لی۔ حباب نے آواز دی اے بشیر تو اپنے ابن عم سے حسد کرتا ہے۔ اسید بن خضیر بولا اچھا ہوا ورنہ اگر سعد کی بیعت ہو جاتی تو خزرج کو اوس پر دائمی فضیلت مل جاتی۔ سب نے ابوبکر کی بیعت کر لی اور چاروں طرف سے لوگ برائے بیعت آنے لگے۔

اس قصہ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ عمر نے سقیفہ کی خبر سنی اور پھر ابوبکر کو اطلاع دی اس کا تعلق کسی وحی سماوی سے نہیں ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ انھوں نے ابوبکر کے آنے کے بعد میت رسولؐ کو چھوڑ دیا۔ سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں کیا؟ اور یہ خبر صرف ابوبکر کو کیوں دی؟ ان امور کی کوئی معقول وجہ علاوہ اس کے نظر نہیں آتی کہ تینوں میں پہلے سے کچھ سازباز تھی۔ اس امر کے تاریخ میں حسب ذیل شواہد ملتے ہیں۔

(۱) عمر نے سقیفہ کی اطلاع صرف ابوبکر کو دی اور باوجود عذر کرنے کے انھیں آنے پر مجبور کیا یہاں تک کہ جب غرض بیان کر دی تو دونوں دوڑ کر وہاں پہنچ گئے۔ اگرچہ ممکن تھا کہ جب انھوں نے عذر کیا تھا تو دوسرے مہاجرین کو بلا لیا جاتا۔ اس حرص وطمع کی علت دوستی کو نہیں قرار دیا جا سکتا۔ اسلیے کہ مسئلہ دوستی کا نہ تھا اور مہاجرین کے استحقاق کا دارومدار عمر کے دوستوں پر نہ تھا بلکہ ہر وہ شخص اس کام کے لیے کافی تھا جو اس امر میں ان کا ساتھ دے سکے۔ یہ بھی ناقابل فراموش بات ہے کہ عمر خود ابوبکر کو بلانے نہیں گئے بلکہ آدمی کو بھیج کر بلایا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ خبر منتشر ہو جائے اور بنی ہاشم اس امر پر مطلع ہو جائیں۔ اپنے قاصد سے یہ بھی کہہ دیا کہ ایک ایسا کام درپیش ہے جس میں

ع جزء اول شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید معتزلی ص ۱۲۷، ۱۲۸

تمہاری حاضری نہایت ضروری ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ اس میں ابوبکر ہی کی کیا ضرورت تھی اگر پہلے سے کوئی سازش نہ ہوتی کہ جسے کامیاب بنانے کی کوشش ہو رہی تھی۔

(۲) وفات نبی کے بارے میں عمر کا موقف اور اُن کا انکار۔ اس سلسلے میں ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ عمر کے حواس معطل ہو گئے تھے اس لیے کہ ان کی زندگی اس قسم کی نہیں ہے جس کا صحیح اندازہ اس اہتمام سے ہوتا ہے جو انھوں نے سقیفہ میں پہنچنے کے بعد کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ جو شخص کسی واقعہ کو سُن کر بدحواس ہو جائے اس میں اتنی فکر نہیں ہو سکتی کہ انصار کے مقابلہ میں باقاعدہ جہاد و دفاع جدال و مخاصمت سے کام لے۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ یہ رائے جس کا اعلان عمر نے بعد وفات نبیؐ اکرم کیا اس کا عقیدہ انھیں چند روز قبل تک نہ تھا جب پیغمبرؐ نے فرمایا ہمیں دوات و قلم دو تاکہ ایسا نوشتہ لکھ دوں جو میرے بعد کام آئے اور عمر نے کہہ دیا کہ کتاب اللہ کافی ہے اور پیغمبرؐ پر مرض کا غلبہ ہے۔ وہ ہذیان بک رہے ہیں (نعوذ باللہ) اس وقت تک ان کا اعتقاد تھا کہ پیغمبرؐ کو موت آئے گی ورنہ فوراً ٹوک دیتے بلکہ کہہ دیتے کہ نبیؐ کے لیے موت نہیں ہے۔ تاریخ ابن کثیر میں یہ بھی ہے کہ ابوبکر سے پہلے عمر بن زائدہ نے یہی آیت پڑھ کر عمر کو سنائی تھی لیکن انھوں نے کوئی توجہ نہ کی۔ جب وہی آیت ابوبکر نے پڑھی تو اعتبار آگیا۔ بھلا بتائیے اس کا اور کیا مطلب ہو سکتا ہے اگر یہ نہ کہا جائے کہ عمر نے اپنی گفتگو سے مسلمانوں میں ایک اضطراب پیدا کرنا چاہا تھا تاکہ لوگ اس کلام کی طرف متوجہ ہو جائیں اور ابوبکر کے آنے سے پہلے خلافت کے بارے میں کوئی فیصلہ نہ ہو جائے۔ یہاں تک کہ ابوبکر کے آتے

ہی ان کا دل مطمئن ہو گیا اور سمجھ گئے کہ اب بیت ہاشمی کی بیعت نہیں ہو سکتی جب تک مقابلہ کے امکانات باقی ہیں۔

(۳) حکومت کی وہ ترتیب جو سقیفہ میں تشکیل پائی ابوبکر والی خلافت[1] ابوعبیدہ والی مال اور عمر والی قضاوت اور آج کی اصطلاح میں پہلا والی سلطنت، دوسرا وزیر اقتصادیات تیسرا وزیر جنائیات۔ اور یہی حکومت اسلامیہ کے عظیم ارکان ہیں۔ ظاہر ہے کہ حکومت کی یہ ترتیب اور عہدوں کی یہ تقسیم جو کہ سقیفہ میں عمل میں آئی کسی وقتی چارہ جوئی کا نتیجہ نہیں ہو سکتی۔

(۴) عمر کا وقت وفات یہ کہنا کہ اگر ابوعبیدہ ہوتے تو انھیں کو حاکم بنا دیتا[2] ظاہر ہے کہ اس تمنا کا سبب ابوعبیدہ کی صلاحیت نہ تھی اس لیے کہ عمر کو علیؑ کی استعداد کا پورا علم تھا لیکن اس کے باوجود انھوں نے نہ چاہا کہ علیؑ اُن کی زندگی میں یا بعد موت حاکم ہو سکیں[3]۔ ابوعبیدہ کی امانت داری (جیسا کہ عمر کا خیال ہے) بھی اس بات کی موجب نہ تھی اس لیے کہ پیغمبرؐ نے صرف ابوعبیدہ کی توصیف نہیں کی بلکہ اس دور میں ایسے اصحاب موجود تھے جنھیں پیغمبرؐ نے اس سے زیادہ محترم قرار دیا تھا۔ جیسا کہ صحاح سنت و شیعہ میں موجود ہے۔

(۵) فاطمہؑ زہرا کو حزب حاکم کو پارٹی بندی سے متہم کرنا۔ (جیسا کہ آئندہ آئے گا)

ع۱ تاریخ ابن اثیر جزء ثانی ص ۱۶۱

ع۲ شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید ج ۱ ص ۶۳

ع۳ الانساب بلاذری ج ۵ ص ۱۶

(۶) امیرالمومنین کا وہ کلام جو آپ نے عمر سے فرمایا تھا اے عمر[1] دودھ دوہ لے جس میں تیرا بھی حصہ ہے آج کی محنت کل نتیجہ دے گی۔

اس کلام سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں اتفاق کی طرف اشارہ ہے جو دونوں میں پہلے سے ہو گیا تھا۔ ورنہ علیؑ تو سقیفہ میں موجود بھی نہ تھے وہ کیا سمجھتے کہ خلافت کس ترتیب سے قرار دی گئی ہے (العیاذ باللہ)

(۷) معاویہ کا وہ خط جو اس نے محمد بن ابوبکر کو لکھا تھا اور اس میں تذکرہ کیا تھا کہ تیرے باپ اور عمر نے علیؑ کے حق کو غصب کیا تھا۔ چنانچہ لکھتا ہے ہم اور تیرا باپ دونوں علیؑ کے فضل کو پہچانتے تھے۔ ان کا حق ہم پر واجب الوفاء تھا لیکن جب رسول اکرمؐ نے دنیا سے رحلت فرمائی تو تیرے باپ اور فاروق نے ان کی مخالفت کر کے ان کا حق چھین لیا اور اپنی بیعت لینا شروع کر دیا اور اس سے مقصد ایک بہت بڑی بات تھی[2]۔

واضح ہے کہ بیعت کا دونوں کے اتحاد کے بعد ذکر کرنا اس بات کا پتہ دیتا ہے کہ یہ ایک سازش تھی جو آج کے پہلے سے تیار ہو چکی تھی۔ میں اپنے موضوع کو اس سے زیادہ طول دینا نہیں چاہتا صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا کوئی تاریخی ثبوت یہ بتاتا ہے کہ ابوبکر خلافت نہ چاہتے تھے۔ جیسا کہ بعض کا خیال ہے۔ مجھے تو سقیفہ کے قصہ ہی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ خلافت کے بڑے خواہاں تھے۔

ع۱ شرح نہج البلاغہ ج ۲ ص ۵

ع۲ مروج الذہب ج ۲ ص ۲۱۵

اس لیے کہ خلافت کے شرائط بیان کرنے کے بعد انھوں نے فوراً دونوں ساتھیوں کا نام پیش کر دیا۔ جس کا طبعی نتیجہ یہ تھا کہ کسی ایک کے لیے بات طے ہو جائے۔ خلیفہ کی یہ جلد بازی اور پھر اس ترتیب کے ساتھ اس امر کا پتہ دیتی ہے کہ ان کا مقصد اپنے ساتھیوں کو آگے بڑھا کر انصار کا حق چھینا تھا جس کا نتیجہ اپنا تقرر ہوتا۔ اس لیے کہ جب دونوں نے ان کا نام پیش کر دیا تو انھوں نے کوئی تردد ظاہر نہیں کیا۔ اور فوراً قبول کر لیا۔ اسی بات کو عمر نے بیان کیا ہے ایک طویل حدیث میں جس میں واضح کیا کہ وہ (ابوبکر) طالب حکومت اور حاسد ترین قریش تھے ؏۱

زمانہ حیات پیغمبرؐ میں بھی شیخین کے حالات سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے دلوں میں کوئی اہم منصوبہ تھی جس کے لیے برابر کوشاں تھے جیسا کہ روایات اہل سنت میں وارد ہوا ہے کہ رسول اکرمؐ نے فرمایا۔ میں نے تنزیل قرآن پر جہاد کیا تم میں سے ایک شخص تاویل قرآن پر جہاد کرے گا۔ ابوبکر بولے میں ہوں؟ عمر بولے میں ہوں؟ آپ نے فرمایا وہ جوتی ٹانکنے والا ہے یعنی علیؑ۔

ظاہر ہے کہ تاویل پر جنگ زمانہ رسولؐ کے بعد ہوگی اور مجاہد بھی امیر الناس ہوگا۔ اس لیے دونوں کو تمنا تھی کہ مجاہد ہم ہوں۔ حالاں کہ تنزیل پر جہاد ان کے لیے زمانہ رسولؐ میں زیادہ آسان تھا اور انھوں نے اس میں مطلقاً شرکت نہ کی۔ ان امور سے خلفاء وقت کے نفسیات کا صحیح اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ بلکہ اس سے آگے بڑھ کر یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ کچھ لوگ حیات رسول اکرمؐ میں ایسے تھے کہ جو ابوبکر اور عمر کے

؏۱ شرح نہج البلاغہ ج ۱ ص ۱۲۵

لیے کام کر رہے تھے۔ جن کی رأس و رئیس عائشہ و حفصہ تھیں جنھوں نے اپنے والدین کو فوراً بلا بھیجا۔ جب پیغمبرؐ نے وقت آخر اپنے حبیب کو طلب کیا اور حالات نے بتایا کہ پیغمبرؐ کوئی وصیت کرنا چاہتے ہیں بلکہ ظاہر یہ ہے کہ وہ روایت جس میں یہ وارد ہوا ہے کہ بعض ازواج نبی نے اسامہ کے لشکر کو روک دیا تھا اس سے مراد بھی یہی عورتیں ہیں۔ کھلی ہوئی بات ہے کہ نبی اکرمؐ اس توقف سے ہرگز راضی نہ تھے ورنہ بعد میں آپ نے جلدی کرنے کا حکم نہ دیا ہوتا۔ اور یہ اس بات کی صاف دلیل ہے کہ ان لوگوں کا رک جانا اور ان عورتوں کا روک دینا کسی خاص سازش کی بنا پر تھا کہ جس میں ان کے چلے جانے سے کامیابی حاصل نہ ہو سکتی۔ یہ بات بھی ہمارے دعویٰ کو بخوبی واضح کرتی ہے۔

پیغمبر اسلام کے لشکر اسامہ کو بھیجنے کی جو تفسیر شیعوں نے کی ہے اس سے دنیا واقف ہے اور وہ یہ کہ رسول کریمؐ نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ کچھ لوگوں نے اس خاص

للع مسند احمد ج ۳ ص ۳۳ میں ہے کہ پیغمبرؐ نے قریش کو ایک ایسے مرد جری سے ڈرایا کہ جس کے دل کا امتحان اللہ ایمان کے لیے کر چکا ہے اور وہ دین کی خاطر قریش کی گردنیں اڑائے گا تو ایک سائل نے پوچھا وہ مرد ابوبکر ہے آپ نے فرمایا نہیں۔ پوچھا عمر؟ آپ نے فرمایا نہیں۔ روایت میں اس سائل کا نام نہیں ہے لیکن واضح ہے کہ جبکہ ابوبکر و عمر کی شجاعت و بہادری کا کوئی چرچا نہ تھا تو سائل کی غرض کچھ اور ہی ہوگی۔ اس کا فیصلہ آپ کے ذمہ ہے۔

؏۱ شرح نہج البلاغہ ج ۱ ص ۱۲۵

بات پر اتفاق کر لیا ہے کہ اب اگر یہ لوگ مدینہ میں رہ گئے تو علیؑ سے مزید مقابلہ کریں گے۔

اگر ہم اس بات میں شک کریں تو کم از کم اتنا تو یقینی ہے کہ پیغمبرؐ نے کبھی مرتبہ علیؑ و ابوبکر کو ترازو کے پلڑوں میں رکھ کر دنیا کو دکھا دیا کہ ان دونوں میں کبھی برابری نہیں ہو سکتی۔ اگر ایسا نہیں ہے تو کیا یہ فطری بات ہے کہ سورۂ برات ایک شخص کو دیا جائے اور پھر چھین لیا جائے۔ وحی الٰہی اس امر کی منتظر تھی کہ ابوبکر آدھے راستے تک پہنچ جائیں تو نازل ہو کر انھیں واپسی کا حکم دے اور علیؑ کو بھیج دے۔ کیا اس کو عبث کہا جائے یا غفلت یا کوئی تیسری بات تھا اور وہ یہ کہ رسولؐ نے محسوس کر لیا کہ ابوبکر میرے ابن عم سے حسد کرتا ہے لہٰذا چاہا کہ ابوبکر کو بھیجکر واپس بلا لیا جائے۔ اور دنیا پر یہ واضح ہو جائے کہ کار تبلیغ علیؑ ہی کا کام ہے جو کہ نفس رسولؐ ہے نہ کہ ابوبکر کا۔ اب اگر کوئی شخص ایک سورہ کا امین نہ بن سکے تو پورے قرآن کا امین کیسے بن سکتا ہے؟

ہم ان تمام بیانات کو دو مختصر نتیجوں پر ختم کرتے ہیں۔ (۱) خلیفہ کو خلافت کی بڑی فکر تھی چنانچہ وہ اس کے لیے برابر کوشاں رہتے تھے (۲) صدیق و فاروق و ابوعبیدہ ایک سیاسی پارٹی بنائے ہوئے تھے جس کے نمایاں خطوط تاریخ میں نہیں نظر آتے۔ لیکن اس کے وجود پر متعدد تاریخی شواہد موجود ہیں۔ اس میں ان کی کوئی توہین نہیں ہے بلکہ انھیں یہی فکر ہر وقت رہنی چاہیئے تھی اگر رسولؐ اللہ کی کوئی نص اس موضوع میں نہ ہوتی۔ لیکن اگر نص رسولؐ ثابت ہو جائے تو پھر سیاست سے ان کی ظاہری علیحدگی اور سقیفہ کی کارروائی کا وقتی چارہ جوئی قرار دینا انھیں خدائی مسئولیت سے

بری نہیں کر سکتا۔

حزب حاکم کی رفتار آلِ محمدؐ کے ساتھ

میں اس وقت اس موقف کی تحلیل نہیں کرنا چاہتا جس میں انصار اور تین مہاجرین میں مقابلہ ہوا تھا تاکہ یہ معلوم کیا جائے کہ اس وقت مسلمانوں کے نفسیات کیا تھے اور سیاسی مزاج کیا تھا۔ اس لیے کہ یہ باتیں میرے موضوع سے ایک حد تک دور ہیں۔ مجھے صرف یہ دیکھنا ہے کہ اس وقت اس ۳ نفری جماعت کے ۳ گروہ مخالف تھے۔

(۱) انصار۔ جنھوں نے خلیفہ اور ان کے ساتھیوں کے ساتھ سقیفہ میں جھگڑا کیا اور عربی ذہنیتوں میں قرابت کی اہمیت کی بنا پر ناکام ہو گئے۔ جس کے نتیجہ میں انصار دو پارٹیوں میں منقسم ہو گئے۔

(۲) بنی امیہ۔ جن کا مقصد یہ تھا کہ حکومت انھیں بھی ملے اور وہ سیاسی بزرگی کہ جو انھیں ایام جاہلیت میں حاصل تھی پھر پلٹ آئے۔ اس جماعت کے لیڈر مشہور ابوسفیان تھے۔

(۳) بنی ہاشم۔ اور ان کے رفقا عمارؓ، سلمانؓ، ابوذرؓ، مقدادؓ وغیرہم جن کا خیال تھا کہ نبیؐ کا طبیعی وارث ہاشمی گھرانہ ہے۔

ابوبکر اور ان کے ساتھیوں نے پہلی جماعت سے مقابلہ کیا اور اپنی اہمیت کے لیے ایسی بات پیش کر دی جو وقتی طور سے بہت کامیاب رہی۔ اس لیے کہ جب قریش عشیرۂ رسولؐ میں رہیں گے تو ان کے مقابلہ میں کوئی دوسرا فریق نہیں آ سکتا۔

ابوبکر اور اُن کے اصحاب کو انصار کے سقیفہ میں اجتماع کرنے سے دو فائدے حاصل ہوئے ۔

(۱) وہ انصار جنہوں نے اپنا مستقل مذہب بنالیا تھا اب اس امر سے مجبور ہو گئے کہ وہ علیؑ کا ساتھ دیں اور حقیقت کو اجاگر کرسکیں ۔

(۲) ابوبکر کو مہاجرین کے حقوق سے دفاع کرنے کا ایسا موقع ہاتھ آگیا تھا جیسا موقع شاید اُن کو زندگی بھر ہاتھ نہ آتا۔ اسلیے کہ جہاں چند مہاجرین جمع ہوجاتے وہاں اُن کے حضور میں کوئی منصب اُن کے ہاتھ نہ لگتا ۔

ابوبکر سقیفہ سے اس عالم میں برآمد ہوئے کہ مسلمانوں کی ایک جماعت ان کے ساتھ تھی یا اسلیے کہ انھوں نے اس دلیل کو پسند کرلیا تھا جو ابوبکر نے پیش کی تھی ۔ یا اس لیے کہ وہ سعد بن عبادہ کے ہاتھ پر بیعت نہیں کرنا چاہتے تھے ۔

حکام وقت نے بنی امیہ کے مقابلہ کی کوئی پرواہ نہیں کی ۔ حالاں کہ ابوسفیان نے اپنے سفر سے پلٹ کر بڑا ہنگامہ مچایا۔ صرف اسلیے کہ وہ لوگ بنی امیہ کی لالچی طبیعتوں سے واقف تھے ۔ ان کی نظر میں ان لوگوں کا ساتھی بنالینا بڑا آسان کام تھا۔ جیساکہ ابوبکر نے کیا۔ اور خود یا عمر کے مشورہ ؑ۱ سے جملہ اموال مسلمین جو ابوسفیان کے ہاتھ میں تھے اس کیلئے مباح ؑ۲ کردیے ۔ اس کے بعد بنی امیہ کو حکومت میں بھی ایک حصہ دے دیا ۔

ع۱ : شرح نہج البلاغہ ج ۱ صفحہ ۱۳۰

ع۲ اس واقعہ کے مطالعہ سے اس سوال کا جواب واضح ہوجاتا ہے جو میں نے ابتداء میں اٹھایا تھا اور وہ یہ کہ اگر خلفاء کا موقف علیؑ کی طرح دشوار گزار ہوتا تو کیا کرتے ؟

اس طرح سے حزب حاکم دونوں جماعتوں کے مقابلہ میں کامیاب تو ہوگیا لیکن اسے اس بات کی خبر نہ ہوئی کہ ہم نے ایک متضاد سیاست سے کام لیا ہے۔ اس لیے کہ سقیفہ کا میدان حکام کو مجبور کررہا تھا قرابت رسولؐ کو مودت سے زیادہ اہمیت دیں اور ریاست دین کے لئے وراثت کو اصل قرار دیں ۔ لیکن بعد کے حالات اس سے مختلف ہو گئے ۔ چنانچہ انھوں نے اپنی سیاست کا رُخ بدل لیا۔ اس لیے کہ قرابت رسولؐ کی وجہ سے قریش دوسروں سے افضل ہیں تو بنی ہاشم تو بہرحال سب سے افضل ہیں ۔

اسی بات کا اعلان کرتے ہوئے امیرالمومنینؑ نے فرمایا تھا کہ اگر ان لوگوں نے انصار کے مقابلہ میں اپنی قرابت کو پیش کیا تو ہماری حجت ان پر قائم ہے ۔ پس اگر ان کی دلیل کامیاب ہے تو حق ہمارا ہے اور اگر ناکام ہے تو انصار صحیح کہتے ہیں۔

اور اسی فقرہ کی وضاحت عباس نے ابوبکر کے سامنے سلسلہ بیان میں کردی ۔ اور کہا کہ تمھارا خیال ہے کہ تم شجرۂ پیغمبرؐ سے ہو تو یاد رکھو کہ تم ہمسایہ ہو اور ہم شاخیں ۔

ایسے وقت میں ہاشمین کی ہیبت حکام وقت کے دلوں پر چھائی ہوئی تھی اسلیے کہ اُن کی نظر میں علیؑ کے پاس دو طاقتیں تھیں ۔

(۱) مادی جماعتوں کو اپنا ساتھی بنالیں اور اس کی آسان ترکیب یہ تھی کہ ابوسفیان و مغیرہ بن شعبہ وغیرہ جو اس وقت ضمیر فروشی پر بری طرح سے آمادہ تھے اُن کو کچھ دے کر ہموار کرلیں ۔ جیساکہ خود ابوسفیان نے خفیہ طور سے علیؑ سے کہا تھا۔

اور یہی وجہ تھی کہ جب ابوبکر نے جملہ جمع کردہ مال اس کو بخش دیا تو خاموش ہوگیا۔ اور پھر زبان سے کوئی کلمہ نہ نکالا ۔ اسی سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایک جماعت پر مادی خواہش

غالب آگئی تھی اور علیؑ میں اتنی طاقت تھی کہ اُن کا پیٹ بھر کر اُن کو اپنا ساتھی بنا لیں۔ اس کے لیے ان کے پاس مال خمس اور غلات فدک سے بہت کچھ جمع ہو سکتا تھا۔

(۲) اس فکر سے کام لیں جو اس وقت عوام کے اذہان پر چھائی ہوئی تھی۔ اس لیے کہ لوگ خاندان رسالت کا زیادہ احترام کرتے تھے بہ نسبت ان لوگوں کے جو صرف شجرہ میں کبھی شریک رہے ہوں۔ اس کا اظہار علیؑ نے ان الفاظ میں فرمایا ہے "ان لوگوں نے شجرہ کو لے لیا اور ثمر کو ضائع کر دیا۔"

حزب حاکم نے یہ دیکھا کہ میری مادی سیاست بہت کمزور ہے۔ اس لیے کہ اطراف مدینہ کے جو مرکز اموال ہیں وہ اس وقت تک سر نہ جھکائیں گے جب تک مدینہ والے انھیں باقاعدہ تسلیم نہ کر لیں حالانکہ مدینہ ابھی باقاعدہ ہموار نہیں ہوا۔ اگرچہ ابوسفیان وغیرہ نے اپنا ضمیر حکومت کے ہاتھ بیچ دیا تھا لیکن پھر بھی حکومت کو یہ خطرہ تھا کہ یہ ضمیر پھر اُس کے ہاتھ بک سکتا ہے جو اُس سے زیادہ دولت صرف کر دے اور یہ کام علیؑ کے لیے بہت آسان تھا۔ لہٰذا ضرورت اس بات کی تھی کہ علیؑ سے اُن کے جملہ اموال چھین لیے جاویں تاکہ انصار کی توقیں حکومت وقت کے ساتھ رہیں اور علیؑ اہل حرص و طمع کی کوئی جماعت تیار نہ کر سکیں۔

اس احتمال کو ذرا بھی بعید نہیں کہا جا سکتا جب تک ہمیں حکومت وقت کا مذاق اس بات کا ثبوت پہنچاتا رہے گا۔ اور جب تک کہ ہمیں اس امر کا علم رہے گا کہ صدیق نے ابوسفیان وغیرہ کی آواز کو درہم و دینار اور ولایت دے کر خرید لیا تھا۔ چنانچہ تاریخ میں ہے کہ جب ابوسفیان کو ابوبکر کی خلافت کی خبر ملی، تو اس نے کہا مجھ سے کیا تعلق ہے۔ لوگوں نے کہا تیرے لڑکے کو بھی حکومت

ملی ہے تو وہ راضی ہو گیا[۱]۔ اب یہ بات بالکل غریب نہیں رہ جاتی کہ حکومت وقت ان اموال کو سلب کر لے کہ جن سے علیؑ کے لیے حزب کے تیار کرنے کا احتمال تھا۔

یہ بات ہم صدیق کے لیے ہرگز عجیب نہیں سمجھ سکتے جب کہ ہم دیکھتے ہیں کہ انھوں نے متعدد آوازیں مال کے ذریعہ خریدی ہیں۔ یہاں تک کہ انھیں کی ایک معاصر عورت نے انھیں متہم کر دیا۔ چنانچہ تاریخ میں ہے کہ جب ابوبکر کے پاس اموال جمع ہوئے تو انھوں نے کچھ مال مہاجرین اور انصار کی عورتوں پر تقسیم کیا۔ اسی میں سے کچھ حصہ بنی عدی بن النجار کی ایک مومنہ کو بھیجا۔ اس نے پوچھا یہ کیا ہے؟ جواب ملا کہ خلیفہ وقت کی تقسیم۔ وہ بول اٹھی تم لوگ مجھے دین کے بدلے رشوت دینا چاہتے ہو۔ میں اس مال میں ہاتھ بھی نہ لگاؤں گی۔ اور یہ کہہ کر واپس کر دیا[۲]۔

میں نہیں سمجھ سکتا کہ یہ اموال خلیفہ کے پاس کہاں سے آئے جب کہ زکوٰۃ کا جمع شدہ تمام مال انھوں نے ابوسفیان کو ہبہ کر دیا۔ کیا اب بھی میں نہ کہوں کہ یہ رسول اللہ کا وہ باقی مال تھا جس پر خلیفہ نے قبضہ کر لیا تھا۔ اور جس کا فاطمہ زہرا مطالبہ کر رہی تھیں؟

میرا یہ خیال صحیح ہو یا غلط لیکن اس واقعہ سے اتنا ضرور معلوم ہو گیا کہ ہمارے جیسے احساسات اس وقت کے بعض اہل ایمان کے دلوں میں موجود تھے جیسا کہ مومنہ نے اظہار بھی کیا۔

---

[۱] تاریخ طبری ج ۳ ص ۲۰۲

[۲] شرح نہج البلاغہ ج ا ص ۱۳۳

یہ بھی ناقابلِ فراموش بات ہے کہ اقتصادی حالات خلیفہ کو اس بات کی دعوت دے رہے تھے کہ حکومتی اموال میں حتی الامکان اضافہ کیا جائے تاکہ آئندہ آنے والی مہموں میں اس سے کام لیا جا سکے۔ اور شاید یہی وہ چیز تھی جس نے خلیفہ کو غصبِ فدک پر آمادہ کیا۔ جیسا کہ عمر و ابوبکر کی گفتگو سے اندازہ ہوتا ہے کہ عمر نے فدک کی واپسی سے یہ کہہ کر منع کیا تھا کہ ابھی لشکر سازی میں مال کی ضرورت پڑے گی۔

یہیں سے ملکیتِ شخصی[۱] کے بارے میں دونوں خلیفہ کی رائے بھی معلوم ہو جاتی ہے کہ اگر حکومت اپنے امور کو ترقی دینا چاہے تو افراد کے مال کو بلا معاوضہ لے سکتی ہے۔ افراد کی ملکیت حکومت کی ضرورت کے وقت ختم ہو جاتی ہے اور یہی رائے اکثر ان خلفاء کی رہی جو ابوبکر و عمر کے بعد تخت حکومت پر قابض ہوتے رہے۔ یہاں تک کہ تاریخ ان کے انعامات سے پُر ہو گئی۔ صرف فرق یہ ہے کہ بعد کے خلفاء نے یہ قانون تمام مسلمانوں کے اموال پر نافذ کیا۔ اور ابوبکر نے صرف بنتِ رسولؐ کے اموال پر۔

حاکم جماعت نے علیؑ کی دوسری طاقت (قرابت نبیؐ) کا علاج دو طریقوں سے کیا۔

(۱) قرابت رسولؐ کی کسی اہمیت کے قائل نہ رہے۔ اور اس طرح ابوبکر کی خلافت کے اس شرعی پردہ کو بھی چاک کر دیا۔ جو اس پر سقیفہ میں ڈالا گیا تھا۔

(۲) اپنے سابق عقیدہ پر باقی رہے لیکن متضاد باتیں وقتی تقاضوں کی بنا پر کرنے لگے اور اسطرح بنی ہاشم کی قرابت کو اپنے مقابلہ سے ہٹ کر باقی ادوار میں تسلیم کرنے لگے۔

حکومت وقت نے اپنی عزت بچانے کے لیے اپنے عقیدہ اہمیت قرابت کو باقی

۱؎ خدا بھلا کرے خلیفہ مسلمین کا کہ حضرت فاطمہؑ کا مال غصب کر کے آج کی نام نہاد اسلامی حکومتوں کے لئے اشتراکیت (نیشنلزم) کا نظریہ چھوڑ گئے۔ (مترجم)

دکھ کر بنی ہاشم کو یہ کہہ کر دبانا شروع کیا کہ لوگوں کے بیعت کر لینے کے بعد نکتہ چینی تفرقہ اندازی ہے اور اس طرح بنی ہاشم کو خاموش کرنا چاہا۔ لہٰذا اپنی اس چالاکی میں کامیاب بھی ہوئی۔

ہم جب سیاست حاکمین وقت کا مطالعہ کرتے ہیں کہ تو ہمیں بخوبی معلوم ہو جاتا ہے کہ ان لوگوں نے آل محمدؐ کے مقابلہ میں ابتداء سے ایک ہی روش اختیار کی تھی جس کا مقصد آل محمدؐ کی قوتوں کو کم کرنا تھا اور بیت ہاشمی کا قدیمی امتیاز جو انھیں نسلاً بعد نسل مل رہا تھا اسے ختم کرنا تھا ہمارے پاس اس رائے پر حسب ذیل شواہد ہیں۔

(۱) خلفاء اور ان کے اصحاب کا علیؑ کے ساتھ سخت برتاؤ یہاں تک کہ عمر نے گھر میں باوجود فاطمہؑ زہرا آگ لگانے کی دھمکی دی اس کا مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کی نظر میں فاطمہؑ کی اتنی حرمت بھی نہیں تھی کہ جو ان لوگوں کو اس برتاؤ سے روک سکے جو انصار نے سقیفہ میں سعد بن عبادہ کے ساتھ کیا تھا اسی کا مظاہرہ اس وقت بھی ہوا جب ابوبکر نے علیؑ کو فتنوں کی آماجگاہ قرار دیا حالانکہ عمر نے اعتراف کیا تھا کہ رسولؐ ہم سے بھی ہیں اور علیؑ سے بھی۔

(۲) خلیفہ اول نے کسی مہم میں بنی ہاشم کو شریک نہیں کیا نہ ان کو کسی ایک بالشت زمین کا حاکم مقرر کیا حالانکہ بنی امیہ پورے پورے ملک پر حاکم تھے۔ اس امر کا ایک قدیمی سازش کا پیدا ہونا اس گفتگو سے معلوم ہوتا ہے جو ابن عباس اور عمر کے درمیان ہوئی جس میں عمر نے اس امر کا اظہار کیا کہ اگر بنی ہاشم اطراف ملک اسلامی کے حاکم ہو گئے تو خطرہ یہ ہے کہ یہ سلسلہ باقی رہ جائے اور خلافت کا رُخ بدل جائے[۱]

۱؎ مروج الذہب بر حاشیہ تاریخ کامل ابن اثیر ج ۵ ص ۱۳۵

جب ہمیں عمر کی رائے سے یہ معلوم ہو گیا کہ اگر بنی ہاشم میں سے کوئی شخص کسی جزوِ حکومت کا مالک ہو گیا تو وہ اپنی پوری حکومت قائم کر لے گا اور خلافت پر قابض ہو جائے گا۔ اور ہم نے یہ بھی دیکھ لیا کہ وہ بنی امیہ جن کا کوئی طریقۂ حیات مقرر نہ تھا وہ زمانہ ابوبکر و عمر میں بڑے بڑے منصب کے مالک تھے اور ہم نے شوریٰ کی ترتیب سے یہ اندازہ بھی کر لیا کہ خلافت بنی امیہ کے رئیس عثمان ہی کو ملے گی تو ہمیں ایک بہت عظیم نتیجہ ہاتھ آ گیا۔ اور وہ یہ کہ عمر و ابوبکر خلافت بنی امیہ کے اسباب برابر پیدا کر رہے تھے اور انہیں بخوبی معلوم تھا کہ بنی امیہ جو کہ بنی ہاشم کے قدیمی دشمن ہیں ان کی سیاسی شخصیت کا نمایاں کر دینا بنی ہاشم کو قیامت تک کے لیے ایک مقابل سے دست و گریباں کر دینا ہے اور اس طرح بنی ہاشم سے ہماری شخصی عداوت ایک قومی عداوت کا رنگ اختیار کر لے گی۔ اور اسی طرح یہ معارضہ وسیع ہوتا جائے گا۔

چونکہ اس کا تعلق ایک شخص سے نہیں بلکہ ایک قوم سے ہے جس کے تیور میں بنی امیہ کی حکومت میں وہ استحکام پیدا ہو جائے گا کہ بنی ہاشم اسے تا قیامت ختم نہیں کر سکیں گے۔

(۳) خلیفہ کا خالد بن سعید بن عاص کو قیادت جیش سے معزول کر دینا

صرف اس بات پر کہ عمر نے انہیں اس کی قلبی محبت پر مطلع کر دیا جو اسے آل محمدؐ

۱؎ قضیہ شوریٰ کا یہی وہ سیاسی راز ہے جس میں محققین نے غفلت برتی ہے اس لیے روایت میں ہے کہ عمر نے تمام اہل شوریٰ کو معاویہ سے ڈراتے ہوئے یہ کہا تھا کہ عنقریب وہی مالک امور اور حاکم سلطنت ہو گا۔ شرح نہج البلاغہ ج ۱ ص ۶۲ یہ کلام اگر ہوشمندی عمر پر دال ہے تو سیاسی چالوں پر اوّل۔

سے تھی اور اس کے وہ مجاہدات یاد دلائے جو کہ اس مرد میدان نے بعد وفات رسولؐ آن کے مقابلے میں کیے تھے۔ ۱؎

اگر ہم اس موضوع کو طول دینا چاہیں تو اس میں قصہ شوریٰ کا بھی اضافہ کریں گے جہاں عمر نے علیؑ کو ان پانچ اشخاص کے برابر کر دیا جن کو روحانیت و نورانیت کے اعتبار سے علیؑ سے کوئی لگاؤ نہ تھا۔ یہاں وہ زبیر ہے کہ جس نے وقت وفات پیغمبرؐ مستحق خلافت صرف علیؑ کو سمجھا تھا۔ لیکن عمر نے اسے مقابل قرار دے کر اور حکومت کی لالچ دلا کر ایسا دیوانہ بنا دیا کہ یہ فکر اس کے ذہن سے بالکل جاتی رہی۔

خلاصہ امر یہ ہے کہ حزب حاکم کا مقصد صرف یہ تھا کہ بنی ہاشم کو عام انسانوں کے برابر قرار دے کر ان کا وہ اختصاص جو انہیں رسولؐ سے حاصل تھا اسے بے وقار بنا دیا جائے۔ اگر حکام نے یہ سمجھ بھی لیا ہو کہ علیؑ اس وقت ہمارے مقابلہ میں انقلاب نہ کریں گے۔ جب بھی وہ اس امر سے قطعاً مطمئن نہیں تھے کہ وہ آئندہ کوئی اقدام نہیں کریں گے۔ اسلیے ضروری تھا کہ جنگ قائم ہونے سے پہلے ہی علیؑ کی مادی اور معنوی قیمت کو گھٹا دیا جائے۔

فدک میں موقف خلیفہ اور طرز مخالفت آل محمدؐ

اب یہ بات سمجھ میں آ گئی کہ خلیفہ کو قضیہ وراثت میں فاطمہؑ کے خلاف ایسا ہی قیام کرنا چاہیئے تھا۔ اس لیے اس نقطہ پر دو غرضوں کا اتحاد ہو رہا تھا۔

۱؎ شرح نہج البلاغہ ج ۱ ص ۱۳۵

ایک طرف فکر تھی کہ فدک کو چھین کر ان کی مادی قوت کم کر دی جائے اور دوسری طرف خیال تھا کہ فاطمہؑ کی توہین کر کے آلِ محمدؐ کا وقار گھٹا دیا جائے۔ ورنہ پھر کون سی شے فدک دینے سے مانع تھی جبکہ فاطمہؑ نے خود ہی وعدہ کیا تھا کہ اس کے منافع کو مصالح[1] مسلمین پر صرف کریں گی۔ شاید خلافت نے محسوس کیا ہو کہ فاطمہؑ کی مراد مصالح مسلمین سے اپنے شوہر کی خلافت ہے۔ ورنہ مال مسلمین ہی سمجھ کر کچھ فاطمہؑ کو دے دیا جاتا۔ جبکہ صحابہ اس سے راضی تھے۔

جب ہمیں یہ معلوم ہو گیا کہ فاطمہؑ کا وجود ان کے شوہر کے لیے بہترین سند تھا اور یہ ایک ایسی دلیل تھی جس کے سامنے جملہ انصار سر جھکا دیتے تھے تو یہ بھی واضح ہو گیا کہ نزاکت وقت کے لحاظ سے خلیفہ کو فاطمہؑ کا سخت مقابلہ کرنا چاہیئے تھا تاکہ مسلمانوں پر یہ امر واضح کر دیا جائے کہ فاطمہؑ عورت ہے اور عورت کی رائے کا معمولی مسائل میں بھی کوئی وزن نہیں ہوتا۔ چہ جائیکہ اہم مسائل میں۔ اور یہ بھی لوگوں کو سمجھا دیا جائے کہ فاطمہؑ ایک زمین کا ناحق دعویٰ کر سکتی ہیں تو خلافت کا دعویٰ بھی ان کے لیے ایسا ہی ہو گا۔

ان ابحاث کے بعد ہم غصب فدک کی دو توجیہیں کر سکتے ہیں۔

(۱) خلیفہ کے اقتصادی حالات نے انہیں مجبور کر دیا تھا۔

(۲) ابوبکر کو خوف تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ علیؑ منافع فدک کو صرف کر کے اپنی حکومت قائم کر لیں۔

اسی طرح فاطمہؑ سے اس سخت مقابلہ کی بھی دو وجہیں ہو سکتی ہیں۔

۱؎ شرح نہج البلاغۃ ج ۴ ص ۸۰

(۱) خلیفہ کے کچھ نفسانی جذبات تھے جو ان کے دل میں تڑپ رہے تھے جن کے اسباب ہم بیان کر چکے ہیں۔ (۲) یہ ایک طویل و عریض سیاست تھی جس کو ابوبکر نے جملہ بنی ہاشم کے مقابلہ کے لیے اختیار کیا تھا۔ جیسا کہ واضح کیا گیا۔

امامؑ کا حزبِ حاکم سے عظیم مقابلہ

امیر المومنینؑ کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ راہِ اسلام میں وہ قربانی اور مبدا اوّل سے وہ اخلاص ہے جس کی بنا پر انہوں نے جملہ شخصی امتیازات کو ختم کر کے ایک ایسی بلند حقیقت کی بنیاد قائم کر دی جو حیات عقیدہ تک باقی رہے گی۔ اس قربانی کا مظاہرہ میدانِ شوریٰ میں کیا گیا جہاں علیؑ نے ثابت کر دیا کہ مبدا اوّل میں فانی شخصیت کبھی اپنی ذات کا خیال نہیں کر سکتی۔ رسولِ اکرمؐ نے ایک طرف بت پرستی کی گمراہیوں کا قلع قمع کیا اور دوسری طرف اپنے حقائق اور معارف کے فیضان سے علیؑ میں وہ بیداری پیدا کر دی کہ جس کی وجہ سے حیات انسانی کے خواہشات مر کر فنا ہو گئے لیکن مبدا و عقیدہ ہمیشہ کے لیے زندہ رہ گئے۔ اور علیؑ کی زندگی بھی انہیں کی حیات سے وابستہ ہو گئی۔[1]

اگر انسانیت کی راہ میں قربانیوں کی ترتیب کے لیے کوئی کتاب لکھی جائے

۱؎ ارشاد رسول اکرمؐ "علیؑ مع الحق والحق مع علیؑ" علیؑ حق کے ساتھ ہے اور حق علیؑ کے ساتھ ہے۔ ان دونوں میں تاقیامت جدائی نہیں ہو سکتی۔ ملاحظہ ہو تاریخ بغداد خطیب ج ۱۴ ص ۳۲۱ تفسیر رازی ج ۱ ص ۱۱۱۔ کفایت الطالب گنجی ص ۱۳۵ مناقب اخطب خوارزم ص ۵۶ پیغمبرؐ نے یہ بھی دعا کی بارالہا حق کا رخ ادھر موڑ دے جدھر علیؑ پھریں۔ مستدرک حاکم ج ۳ ص ۱۲۵ کنز العمال ج ۶ ص ۱۵۷ ترمذی ج ۲ ص ۲۱۳

تو علیؑ کا نام اس کی دائمی تشریح[عہ] ہوگا۔ اگر قوانین سماویہ کی کوئی عملی تعبیر ہو سکتی ہے تو وہ ذات علیؑ ہے جو تا قیام قیامت قوانین الٰہیہ کی حکایت کرتی رہے گی۔ اگر پیغمبرؐ نے امت میں قرآن و علیؑ کو چھوڑا ہے تو صرف اس لیے کہ قرآن علیؑ کے کارناموں کو بیان کرے اور علیؑ قرآن کے عملی نمونے پیش کریں[عہ]۔ اگر اللہ نے علیؑ کو نفس رسولؐ[۳] قرار دیا ہے تو صرف یہ بتانے کے لیے کہ حیات پیغمبرؐ تھا علیؑ تک ختم نہیں ہو سکتی۔ بلکہ علیؑ کے پہلو میں وہی دل[عہ] جو نبیؐ کے سینے میں تھا۔ اگر نبی اکرمؐ مکہ سے علیؑ کو بستر پر لٹا کر نکلے تو صرف یہ بتلانے کے لیے کہ ہماری حیات کی راہیں مبدا اعلیٰ کی طرف سے متعین ہوتی ہیں۔ اگر قضیہ الوہیت یہ چاہتا ہے کہ کوئی شخص اسے نمایاں کرے اور کوئی اس کی راہ میں قربان ہو تو نبیؐ کی ہجرت اور علیؑ کی قربانی کی شدید ضرورت تھی[۴]۔ اگر وحی سماوی نے صرف علیؑ کے لیے مسجد میں[عہ] جانا خاص حالات میں جائز قرار دیا ہے تو اس کا مطلب صرف اتحاد ہے کہ مسجد دنیائے مادہ میں رمز الٰہی ہے اور علیؑ حیات عقیدہ و روحانیت میں۔ اگر آسمان نے علیؑ کی مدح لافتی[۵] کہہ کر کی تو صرف اسلیے کہ

عہ ارشاد نبی کریمؐ علیؑ کی ضربت عبادت ثقلین سے افضل و برتر ہے۔ مستدرک حاکم ج ۳ ص ۳۲
عہ حدیث ثقلین۔ صواعق محرقہ ص ۱۳۶ (عبقات الانوار۔ حدیث ثقلین)
۳ تفسیر رازی آیت مباہلہ۔ اسباب النزول واحدی ص ۵
عہ مسند احمد ج ۱ ص ۳۶۹، مستدرک حاکم ج ۳ ص ۱۲۵، شرح نہج البلاغہ ج ۲ ص ۴۵۱۔ تذکرہ ابن جوزی، مناقب خوارزمی، تاریخ الخلفاء سیوطی، صواعق ابن حجر، خصائص نسائی۔
۵ تاریخ طبری ج ۲ ص ۱۷، سیرت ابن ہشام، شرح نہج البلاغہ، مناقب خوارزمی

علیؑ کی طاقت قرآن کا وقار قائم کر سکتی ہے اور اس کی مردانگی تک انسان کی توتیں اور اس کا اخلاص نہیں پہنچ سکتا۔

یہ زمانہ کا مذاق تھا کہ جن فتوحات کی مدح آسمان سے کی جائے انہیں کو علیؑ کے نقائص میں شمار کیا جائے اور ان کو اس ابوبکر سے گھٹا دیا جائے جس نے دنیا میں اُن سے زیادہ اتنی ہی زندگی کی جس میں وہ کفر و شرک کی آماجگاہ تھا۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ وہ ذات جو کفر و اسلام کا سنگم تھی کیونکر مقدم ہوگی اس ہستی پر جس کی ابتدا توحید سے اور انتہا الوہیت پر ہوئی۔

اگر جدید تحقیقات نے آج اجسام دائرہ میں ایسی طاقت معلوم کر لی ہے جو انہیں ایک معین خط پر چلاتی ہے تو علیؑ میں یہی طاقت سیکڑوں برس پہلے موجود تھی۔ فرق یہ ہے کہ وہ فیزیائی طاقت نہ تھی بلکہ ایسی سماوی قوت تھی جس نے ان کی اعلیٰ منزل کو محفوظ کر کے انہیں ایک ایسا محور قرار دے دیا تھا جس پر حیات انسانی گردش کر کے اسی سے اپنی روحانیت و ثقافت و روحیت و جوہریت حاصل کرتی رہے گی۔ حد یہ ہے کہ اسی سماوی طاقت نے ایسا جادو کیا کہ جس سے عمر بھی محفوظ نہ رہ سکے بلکہ انہیں اعلان کرنا پڑا: "لولا علی لھلك عمر" اور اسی طاقت کا ظہور اس وقت ہوا جب مسلمان علیؑ کے پاس جمع ہو کر انہیں خلافت پر مجبور کرنے لگے۔ ایسے اجتماع کی تاریخ میں نظیر کم ملتی ہے۔

ان واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ علیؑ اپنی سماوی طاقت کی بنا پر اسلام کی ضروریات[لہ]

لہ اس بیان کی روشنی میں رسول اکرمؐ کے اس فقرہ کے معنی سمجھیں جو آپ نے جنگ تبوک میں جاتے ہوئے فرمایا تھا۔ "یا علیؑ یا میں رہوں یا تم رہو"۔ ملاحظہ ہو خصائص نسائی ص ۶، مسند احمد ج ۱ ص ۳۳۱، مناقب خوارزمی ص ۸۵، ذخائر العقبیٰ ص ۸۶۔

میں سے ایک ضرورت تھے لہٰذا وہ آفتاب تھا جس پر فلک اسلامی کی گردش موقوف تھی۔

حالاتِ زمانہ نے یہ بات بالکل واضح کردی کہ سیاست وقت میں فوری انقلاب پیدا کرنا ایک غیر ممکن سی بات تھی اس لیے کہ یہ بات شخصیت امامؑ کے منافی بھی تھی جس کا قہری نتیجہ یہ تھا کہ سیاست وقت ٹیڑھی راہ اختیار کرے۔ یہاں تک کہ اس نقطہ پر پہونچ جائے جہاں تک کہ امویوں نے اسے پہنچایا۔ اس کے بعد تو خود راہِ راست پر آجائے گی جس طرح کہ گاڑی جب راہ سے منحرف ہوجاتی ہے تو اسے کج ہوکر راستہ پر آنا پڑتا ہے۔ حیات علوی کا یہ وہ موضوع ہے جو انتہائی تفصیل کا طالب ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ علیؑ کی اس سیاست کو خوب واضح کیا جائے کہ انھوں نے کس طرح حکومت وقت کی مخالفت کی اور اسی کے ساتھ اس کو راہِ راست پر بھی لگا دیا۔ اگر امامؑ کے جملہ اقدامات ایک نمایاں حیثیت رکھتے ہیں تو خلافت میں آپ کا اقدام اور بھی اہمیت رکھتا ہے۔

امام کا سکوت اور احادیث سے احتجاج نہ کرنے کے اسباب

اگر عقیدہ الٰہیہ ایک ایسا مجاہد چاہتا ہے جو اس پر اپنی جان قربان کرے تو اسے ایک ایسے انسان کی بھی ضرورت ہے جو اس قربانی کو قبول کرکے مبدا کی ترویج کرے۔ اسی کام کے لیے خدا نے نبیؐ و علیؑ کا انتخاب کیا تھا۔ ایک نے فرشِ نبیؐ پر قربانی دی اور دوسرے نے مدینہ میں مبداءِ اوّل کی ترویج کی۔ امام علیؑ کے لیے یہ بات بعد وفات نبیؐ بالکل ناممکن تھی اس لیے کہ اگر وہ حکومت وقت کو راہِ راست پر لانے

کے لیے اپنی جان قربان کر دیتے تو دوسرا کون ہوتا جو ان قوانین کو تقویت پہنچاتا اور ان کی ترویج کرتا۔ سبطین پیغمبرؐ اگرچہ موجود تھے لیکن بوجہ کمسنی وہ مادی طور پر اتنا بڑا اقدام نہ کر سکتے تھے۔ علیؑ حکومت وقت کے خلاف ایک دوراہے پر کھڑے تھے جس کی دونوں راہیں خطرناک تھیں۔ (۱) ابوبکر کے خلاف مسلح انقلاب کی مہم چلا دیں (۲) جملہ مصائب و آلام کو برداشت کرکے خاموش ہو جائیں۔ اگر انقلاب کرتے تو اس کے کیا نتائج ہوتے اس کو ہم تاریخ کی روشنی میں آئندہ واضح کریں گے۔

ظاہر ہے کہ حکام وقت ادنیٰ معارضہ سے تاج و تخت سے دست بردار نہیں ہو سکتے تھے اس لیے کہ مسئلہ خلافت میں وہ بہت زیادہ حریص و طامع تھے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ نئی حکومت کے استحکام کے لیے پورا پورا مقابلہ کرتے اور اس وقت یہ امکان بھی تھا کہ سعد بن عبادہ اپنی حکومت کے لیے ایک دوسری جنگ کھڑی کر دیتے جیسا کہ انھوں نے طالبین بیعت سے علی الاعلان کہہ دیا تھا "میرے ترکش کے تمام تیر جب تک ختم نہیں ہو جائیں گے اور میرے نیزے جب تک رنگین نہ ہو جائیں گے، میری تلواریں جب تک کام کریں گی، میرے اہلبیت و انصار جب تک میرا ساتھ دیں گے میں تمہاری بیعت نہ کروں گا۔"

میرا خیال ہے کہ اس وقت انھوں نے اپنے پاس جنگ کی قوت نہیں دیکھی اس لیے صرف تہدید و توعید پر اکتفا کر لی اور اس بات کے منتظر رہے کہ امر حکومت میں کچھ تنزلی ہو جائے تو تلوار نیام سے کھینچیں۔ پھر ایسے وقت میں انھیں حق تھا کہ ان کی غیرت و حمیت کو جوش آئے اور ان کا خوف جاتا رہے۔ اور اس طرح وہ حکومت وقت کو ضعیف سمجھ کر ایک نئی جنگ قائم کر دیں اور اپنی تلوار سے مہاجرین کو

مدینہ سے نکال باہر کریں۔ جیسا کہ انھوں نے سقیفہ میں اعلان کیا تھا۔ اور اس طرح علیؑ کو اپنے انقلاب سے کوئی فائدہ نہ حاصل ہو سکے۔

ہم اس وقت بنی امیہ کو فراموش نہیں کر سکتے کہ وہ جاہ و حشم کے کس قدر دلدادہ تھے اور آخری دور میں انھیں مکہ میں کچھ تصرف بھی حاصل ہو گیا تھا۔ اسی لیے تو ابوسفیان اسلام کے خلاف ہر جنگ میں آگے آگے رہتا تھا اور عتاب بن اسید بھی رئیس بنا رہتا تھا۔

جب ہم تاریخ میں یہ واقعہ دیکھتے ہیں کہ جس وقت خبر وفات پیغمبرؐ مکہ میں پہنچی تو آپ کا عامل عتاب بن ابی العاص بن امیہ مخفی ہو گیا اور شہر میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ یہاں تک کہ قریب تھا کہ اہل مکہ مرتد ہو جائیں ہمیں وہ تعلیلیں پسند نہیں آئیں جو لوگوں نے اس واقعہ کی کی ہیں اور ہم اس بات کو مان سکتے ہیں کہ وہ لوگ ابتداء سے صرف یہ خیال کر کے رک گئے کہ ابوبکر جب حاکم ہو جائے گا تو ہم لوگ بھی مدینہ پر غالب آجائیں گے۔ اسلیے کہ خلافت ابوبکر روز وفات پیغمبرؐ طے ہوئی ہے اور ظاہر ہے کہ دونوں خبریں مکہ ایک ساتھ پہنچی ہوں گی۔ بلکہ میرا احتمال قوی یہ ہے کہ عتاب نے حالات کا جائزہ لینے کے لیے اپنے کو مخفی کر دیا ہوگا۔ اور جب اسے یہ معلوم ہو گیا کہ ابوسفیان نے بنی امیہ کے مصالح کی بنا پر حکومت وقت کو تسلیم کر لیا ہے تو ظاہر ہو کر اس نے امور حکومت سنبھال لیے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی امیہ میں ایک سلسلہ اس وقت قائم ہو چکا تھا۔ ہم اپنے اس خیال کی تائید ابوسفیان کے ان اقوال سے کر سکتے ہیں

۱؎ تاریخ کامل ج ۲ ص ۱۲۳

جو اس نے ابوبکر کے خلاف کہے تھے جن کا ماحصل یہ تھا کہ اس گرد کو سوائے خوف کے کوئی دوسری چیز بٹھا نہیں سکتی۔ اور علیؑ اور عباس کے بارے میں اس نے کہا "ہم ان کے شانے پکڑ کر انھیں بلند کریں گے" اس کا کھلا ہوا مطلب یہ ہے کہ بنی امیہ اس وقت انقلاب کے لیے تیار تھے۔ اور جب حضرت علیؑ کے سامنے یہ مسئلہ پیش ہوا تو انھوں نے اس کی شرارت کو تاڑ لیا اور ان پر یہ بات واضح تھی کہ ان کی بات کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ اسی لیے انھوں نے اس کی طلب کو ٹھکرا دیا۔ صرف یہ خیال کر کے کہ اگر میں نے کوئی اقدام کیا تو یہ لوگ اپنے مصالح کو نہ حاصل ہوتے ہوئے دیکھ کر مخالفت کریں گے اور ان کی مخالفت خروج از دین تک منتہی ہو گی۔ اور اس طرح مکہ و مدینہ میں ایک خلیج حائل ہو جائے گی۔

نتیجہ یہ ہوتا کہ علوی انقلاب ایک خونی انقلاب ہوتا جس کی پشت پر ہزاروں انقلابات تھے اور ایسے حالات سے منافقین اور مخالفین اسلام کو بڑے فائدے حاصل ہوتے۔

حالات اس قسم کے نہیں تھے کہ علیؑ تنہا اپنی آواز بلند کریں اور باقی آوازیں دب کر رہ جائیں۔ بلکہ اس کے عوض بڑی آوازیں بلند ہوتیں اور مختلف جنگیں ظہور میں آتیں۔ اور ایسے سخت وقت میں اسلامی وقار تباہ و برباد ہو کر رہ جاتا جب کہ اسلامی اجتماع کی شہ یہ ضرورت تھی اور مسلمانوں کو آئندہ آنے والے خطرات کے مقابلے کے لیے پورے پورے اسباب کی احتیاج تھی۔ وہ علیؑ کہ جس میں راہ خدا میں قربانی کی پوری استعداد اس وقت سے موجود تھی جب وہ خانہ کعبہ میں متولد ہوئے اور اس وقت تک رہی جبکہ خانہ خدا میں شہید ہوئے۔ انھوں نے اپنی حقیقی منزل

اور اپنے الٰہی منصب کو صرف اس بات پر قربان کر دیا کہ اسلامی وقار نہ گھٹنے پائے۔

یہ اور بات ہے کہ اس طرح رسالت محمدیہ کے بعض اجزا تشنۂ تبلیغ رہ گئے اس لیے کہ دعوت ذوالعشیرہ میں بنی عبدالمطلب کو جمع کر کے جس طرح رسولؐ نے اپنی رسالت کا یہ کہہ کر اعلان کیا تھا کہ مجھ سے بہتر پیغام دنیا کا کوئی جوان نہیں لایا۔ اسی طرح علیؑ کی خلافت کا اعلان ان الفاظ میں کیا تھا کہ یہ میرا بھائی، وصی[1] اور خلیفہ ہے اس کی اطاعت تمہارا فریضہ ہے۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ خلافت علیؑ تکملہ رسالت رسولؐ ہے اور وحی سماوی محمدؐ کبیر و محمدؐ صغیر کے مناصب کا ایک ساتھ اعلان کر رہی ہے۔

وہ علیؑ جو پروردہ آغوش رسولؐ تھا جس کے ساتھ ہی اسلام پرورش پا رہا تھا کہ گویا دونوں پیغمبرؐ کی عزیز اولاد اور آپس میں حقیقی بھائی تھے۔ اسے اس اخوت کا پورا احساس تھا اور اسی جذبے نے اسے اپنے بھائی کی پوری پوری موافقت پر آمادہ کیا۔ یہاں تک کہ اس نے ارتداد کی جنگوں میں بھی شرکت کی اور مسلمانوں کی مخالفت اسے اپنے مقدس فریضے سے روک نہ سکی[2] ظاہر ہے کہ ابوبکر نے اگرچہ کرسی حکومت کو چھین لیا میراث رسالت کو غصب کر لیا لیکن اسی کے علی الرغم اسلام نے علیؑ کو اتنا بلند کیا کہ اُن کے کارناموں کو سنہری حرفوں میں قرآن مقدس میں تحریر کر دیا۔

---

[1] تاریخ طبری، تاریخ کامل، شرح نہج البلاغۃ،

[2] شرح نہج البلاغۃ ج ۴ ص ۱۶۵

امامؑ نے انقلاب کا ارادہ بالکل ترک کر دیا لیکن اب کیا کریں؟ اور کون سی روش اختیار کریں؟ آیا فریق مخالف کے سامنے نصوص پیغمبرؐ پیش کریں اور اُن کلمات سے احتجاج کریں جنھیں پیغمبرؐ نے صراحتاً بہ اعلان کہا تھا کہ علیؑ ہی وہ قطب ہے کہ جس پر فلک اسلامی چکر لگا رہا ہے اور علیؑ ہی وہ رئیس ہے جسے آسمان نے زمین کے لیے مقرر کیا ہے۔

یہ سوال علی کے ذہن میں کروٹیں لیتا رہا یہاں تک کہ حالاتِ حاضرہ اور اوضاع موجودہ نے علیؑ کو یہ حل بتایا کہ نصوص کے پیش کرنے سے ایک مدت خاص تک خاموشی اختیار کریں؟۔

اِس دور کے تشویش ناک حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر علیؑ نصوص مقدسہ کو پیش کر کے اُن سے احتجاج کرتے تو اس کا نتیجہ بڑا خراب ہوتا۔ اس لیے کہ اس وقت حق و باطل کے امتیاز کا پیمانہ سیمابی افکار اور مضطرب خواہشات کو قرار دے دیا گیا تھا۔

ظاہر ہے کہ نصوص پیغمبرؐ سے وہی لوگ واقف تھے جو مدینہ کے رہنے والے تھے اور یہ کلمات انھیں کے پاس بطور امانت محفوظ تھے جو عوام الناس تک انھیں کے ذریعے پہنچنے والے تھے۔ لہٰذا اب اگر امامؑ انھیں روایات سے احتجاج کرتے اور انھیں کو لوگوں کے سامنے بطور دلیل پیش کرتے تو اس کا فطری نتیجہ یہ ہوتا کہ مخالف جماعت صدیق امت کی تکذیب کرتی اور ان نصوص کا شدت سے انکار کرتی اور اس طرح وقار کلام رسالت مٹ جاتا اور لوگ دین سے خارج ہو جاتے۔

بہت ممکن ہے کہ علیؑ کی آواز میں اتنی طاقت نہ ہوتی جو اس نقار خانہ میں کارگر ہو سکے۔ اسلیے کہ اکثر قریش یعنی بنی امیہ تو خود ہی سلطنت کے طالب تھے اور انھیں یہ معلوم تھا کہ نصوص کی بنیاد پر کسی کو مقدم کر دینا مذہب امامیہ کی اساس کو مستحکم کر دینا ہے اور اگر یہ نظریہ مسلمانوں کے دماغ میں راسخ ہو گیا تو حکومت آل محمدؐ میں منحصر ہو کر رہ جائے گی اور ہم ہمیشہ کے لیے اس سے محروم ہو جائیں گے۔

اس بات کا اندازہ بس عمر کے اس کلام سے ہوتا ہے جو اس نے ابن عباس سے علیؑ کو خلافت نہ دینے کے عذر میں پیش کیا تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ قوم خلافت و نبوت کو ایک گھر میں نہیں دیکھنا چاہتی[1]۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ پہلے دن علیؑ کو خلافت دے دینا ہمیشہ کے لیے بنی ہاشم میں منحصر کر دینے کے مترادف ہے۔ اس کی کوئی وجہ سوائے اس کے نہیں ہو سکتی کہ جمہور کی نظر میں یہ قانون بن جاتا کہ خلافت کا منصب آسمان سے ملنا چاہیئے۔ انتخاب عوام سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔

لہٰذا اگر قریش علیؑ کی جنگ میں مدد بھی کرتے تو مسئلہ نص میں تو بہر حال ساتھ نہ دیتے جب علیؑ یہ کہتے کہ رسولؐ اکرم نے یہ فرمایا ہے کہ میں دو چیزیں چھوڑے جاتا ہوں۔ ایک قرآن اور دوسرے اہلبیتؑ۔

رہ گئے انصار تو انھوں نے نصوص کی توہین اس وقت کر دی تھی جب

---

[1] تاریخ کامل ج ۳ ص ۲۴

سقیفہ بنی ساعدہ میں حکومت کی طمع لے کر پہنچ گئے تھے تاکہ کسی کو اپنا امیر بنالیں اب اگر علیؑ روایات پیش کرتے تو اس مجمع سے کون گواہی دیتا اس لیے کہ وہ جانتے تھے کہ علیؑ کی تصدیق کرنا ایک متضاد منطق میں مبتلا ہونا ہے۔ اور یہ بات اپنے لیے کوئی شخص قبول نہیں کر سکتا خصوصاً ایسے وقت میں۔

اگر کوئی یہ کہے کہ اس وقت کا یہ کہنا کہ ہم غیر علیؑ کی بیعت نہ کریں گے یہ بھی تو ایک تضاد ہے تو یہ غلط فہمی ہو گی اس لیے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ خلافت انتخابی چیز ہے۔ ہم علیؑ کو چھوڑ کر ابوبکر کو منتخب نہ کریں گے۔ اس کا مطلب نصوص کا قبول کر لینا ہرگز نہیں ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر مہاجرین کی بات کیوں مان لی؟ تو اس کا جواب واضح ہے اور وہ یہ کہ انصار نے پہلے سے کوئی خاص بات طے نہیں کی تھی بلکہ وہ تو ایک مشورہ کر رہے تھے جیسا کہ حباب بن منذر کی اس سخت گفتگو سے اندازہ ہوتا ہے جو انھوں نے مہاجرین کے خلاف کی تھی جس سے اجتماع میں ایک ہلچل مچ گئی۔

حاصل کلام یہ ہے کہ امامؑ نے اندازہ کر لیا تھا کہ روایات کا اظہار کرنا حاکم جماعت کو اس کے انکار پر آمادہ کرتا ہے اور اس وقت میں میری تائید کرنے والا کوئی نہیں ہے اسلیے کہ بعض لوگ تو وہ ہیں جنھیں خواہشات نصوص کی عملی مخالفت پر آمادہ کر رہے ہیں۔ اور بعض وہ ہیں جو خیال کرتے ہیں کہ نصوص کی تائید کر دینا خلافت کو بنی ہاشم کے نام وقف کر دینے کے مترادف ہے اب جب کہ حکومت اور اس کے انصار نے مخالفت کی ٹھان لی اور باقی نے سکوت اختیار کر لیا

تو روایات کا سنانا ان کی معنوی عظمت کا گھٹانا ہے اور ادلہ امامت کو حقیقتاً تباہ کرنا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ مدینہ کے باہر والے سب انکار ہی کرتے اس لیے کہ ان کا دار و مدار مدینہ پر تھا اور مدینہ اسی انکار پر تلا ہوا تھا جس پر اسے خواہشات مجبور کر رہے تھے۔

اگر ہم فرض بھی کر لیں کہ ایک نہ ایک جماعت علیؑ کی تائید میں بھی پیدا ہو جاتی جو ان کے نصوص کی شہادت دیکر حکومت وقت کے انکار کا صحیح مقابلہ کرتی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ حکومت کی نظر میں بڑھ جاتی اور وہ سلطنت جو اپنی سلطنت بنانے کے لیے پوری کوشش کر رہی ہے انھیں اذیت دینے پر آمادہ ہو جاتی اور آخر کار ایک جنگ کھڑی ہو جاتی۔ جس کی مادی قوت فی الحال علیؑ کے پاس موجود نہ تھی جیسا کہ ہم نے ثابت کر دیا۔

نصوص سے احتجاج کا ایک اثر یہ بھی ہوتا کہ سیاست حاکمہ وہ تمام راہیں اختیار کرتی جن سے ذہنیت اسلامی سے احادیث نبویہ کو محو کر دیا جائے اسلیے کہ اسے معلوم تھا کہ خلافت حاضرہ کے خلاف مخالف کے پاس یہی بہترین قوت ہے اور یہی قوی ترین اسلحہ۔

میرا خیال ہے کہ اگر عمر کو روایات کے ان تمام خطرات کا اندازہ ہو جاتا جو بنی امیہ کو پیش آئے جب روایات ان کے سامنے پیش کی گئیں تو پہلے ہی اُن کی جڑیں کاٹ دیتے اور اس چراغ کو پہلے ہی خاموش کر دیتے۔ امامؑ کی نظر میں یہی انجام تھا اسی لیے انھوں نے ان روایات کو چھپا لیا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ سیاست وقت انھیں آج ہی کھلونا بنا دے اور پھر آئندہ انھیں پیش کرنے کا موقع باقی نہ رہے۔ اسی لیے امام نے دوسروں کی توجہ کو اس طرف سے موڑ دیا۔ حالاں کہ عمر خود ہی ولی المومنین بنص رسولؐ انھیں کہا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ امامؑ کو اپنے بھائی کی کرامت کا

بھی خیال تھا کہ نصوص کے ساتھ اس کی بھی توہین ہو گی۔ حالاں کہ وہ ان کے نزدیک دنیا کی عظیم ترین ہستی تھی۔ ابھی تو امامؑ کی نظر میں وہ منظر بھی ہے جب ان کے بھائی نے قلم و دوات طلب کیا تھا اور عمر نے انھیں ہذیان گو کہہ دیا تھا جس کے متعلق عمر نے ابن عباس سے اعتراف بھی کیا کہ وہ علیؑ کو خلیفہ بنانا چاہتے تھے۔ [علہ] ایسے حالات میں وہ روایات کیوں کر سناتے۔

میں یہ نہیں کہتا کہ رسولؐ علیؑ کو وصی ہی بنانا چاہتے تھے۔ مجھے تو صرف یہ بتانا ہے کہ وہ عمر جو پیغمبرؐ کی روبرو مخالفت کر سکتا ہے۔ انھیں حال حیات میں دیوانہ کہہ سکتا ہے جس کی مخالفت قرآن و اسلام دونوں نے کی ہے کیا اس میں اتنی جرأت نہ تھی کہ روایات کو سن کر کہہ دیتا کہ یہ پیغمبرؐ کی طبعزاد ہیں۔ ان کو وحی الٰہی سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ بلکہ اس کا احتمال زیادہ قوی ہے اسلیے کہ پیغمبرؐ کی تحریر سے اتنے خطرات نہ تھے جتنے علیؑ کے روایات کو سنا دینے سے پیش آنے والے تھے۔

اگر پیغمبرؐ وقت آخر نص کو عمر کے قول کی بنا پر چھوڑ سکتے ہیں تو علیؑ بھی نص کو عمر کے آئندہ اقوال کے احتمال کی بنا پر چھپا سکتے ہیں۔

میری بحث کا نتیجہ یہ ہوا کہ علیؑ کو ایک خاص وقت تک نصوص کے اظہار سے حسب ذیل امور روک رہے تھے۔

(۱) اس وقت ایسے لوگ موجود نہ تھے جن کی شہادت پر علیؑ کو اطمینان ہوتا۔

(۲) نصوص کو پیش کرنا جماعت حاکمہ کو ان کی قیمت معنوی کی طرف متوجہ کرنا تھا۔

علہ: ظاہر ہے کہ جس کی نظر میں پیغمبرؐ کے سامنے ان کے ارشادات کا کوئی وزن نہ تھا وہ انتقال کے بعد ان فرامین کی کیا قیمت لگاتا۔ (مترجم)

اور اس طرح ان کی توہین ہو جاتی۔

(۳) نصوص کو پیش کرنا ایک بڑے انقلاب کے لیے آمادہ ہونا تھا۔ جس کے لیے علیؑ قطعاً تیار نہ تھے۔

(۴) عمر کو آخر وقت نبیؐ کو متہم کرنے نے علیؑ پر یہ بات بالکل واضح کر دی تھی کہ یہ جماعت اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے اور اپنی حکومت جمانے کے لیے ہر دینی اور مذہبی قربانی پیش کر سکتی ہے اور اس طرح عظمت رسولؐ کی دوبارہ اہانت کا اندیشہ ہے۔

مطالبہ فدک سیاست علوی کا اعلیٰ ترین کارنامہ ہے

امامؑ نے آخر کار ایک قطعی فیصلہ کر لیا اور وہ یہ کہ نہ کوئی انقلاب کریں گے اور نہ علی الاعلان اس وقت تک کوئی روایت پیش کریں گے جب تک کہ لوگ ابوبکر و عمر و عثمان کے خلاف شہادت دینے کے قابل نہ ہو جائیں! اسی لیے علیؑ نے خفیۃً زعمائے مسلمین اور رؤسائے مدینہ کے دروازوں پر جا کر انھیں موعظہ کرنا شروع کر دیا۔ انھیں عذاب الٰہی سے ڈرانے لگے اور ان کے ساتھ ان کی شریکہ حیات بھی تھیں جو اُس کے خاموش جہاد کی قیادت کر رہی تھیں۔ ظاہر ہے کہ اس سے علیؑ کا مقصد لشکر کی جمع آوری نہ تھا۔ اس لیے کہ علیؑ کے نام کو انصار نے پہلے بھی پیش کیا تھا۔ بلکہ مقصد صرف یہ تھا کہ خوف خدا کے احساس سے رائے عامہ میرے ساتھ ہو جائے۔

اب مسئلہ فدک اٹھتا ہے جسے سیاست علوی میں صدارت کی جگہ حاصل ہے اس لیے کہ وہ دور فاطمی جس کے خطوط ہارون نبوت نے معین کیے تھے اس شبانہ گردش

سے بالکل متحد تھے جس میں فاطمہؑ شریک تھیں۔ اب گردش فاطمی اس بات کی سزاوار تھی کہ خلافت کا رُخ بدل دیا جائے اور خلافت صدیق کا یوں ہی خاتمہ کر دے جیسے آنکھ کھلتے ہی خواب کی انتہا ہو جاتی ہے۔

گردشِ فاطمی کا خلاصہ یہ ہے کہ صدیق سے اپنے مغصوبہ اموال کا مطالبہ کرے اور اسی طرح اساسی مسئلہ پر بھی اعتراض ہو جائے اور لوگوں پر واضح ہو جائے کہ انھوں نے علیؑ کو چھوڑ ایسے شخص کو اختیار کیا ہے جو ہوس کا بندہ اور خواہشات کا غلام ہے۔ اور جو قرآن و سنّت کی صریحی مخالفت کرتا ہے۔

جب یہ فکر فاطمہؑ کے ذہن نشین ہو گئی تو وہ اٹھیں اس ارادہ سے کہ حالات وقت کی اصلاح کریں۔ اور حکومت اسلامی جس کی بنیاد سقیفہ میں پڑی ہے کے رُخ سے وہ گرد دھو دیں جس سے چہرہ اسلام آلودہ ہو گیا ہے۔ اور اس کا بہترین ذریعہ ہے کہ حکومت کو کھلی خیانت سے متہم کریں اور لوگوں کو بتلائیں کہ یہ لوگ قانون الٰہیہ کی توہین کرتے ہیں۔ اُن کا انتخاب خلاف سنت و کتاب اور دور از صحت و صواب ہے۔ فاطمہؑ کو مقابلہ کے لیے وہ ایسی قوتیں حاصل ہو گئیں جو علیؑ کو حاصل نہ ہوتیں اگر وہ بجائے فاطمہؑ قیام کرتے۔

(۱) فاطمہؑ اپنے مصائب اور اپنے باپ کی نظر میں اہمیت کے باعث زیادہ طاقتور تھیں اس بات پر کہ مسلمانوں کے احساس کو بیدار کر سکیں اور اُن کے جذبات کو اُبھار سکیں۔ اور مسلمانوں کو اپنے باپ سے ایک روحانی رشتے کے ذریعے متصل کر دیں۔

(۲) فاطمہؑ کو معلوم تھا کہ میری مخاصمت کسی حد تک پہنچ جائے لیکن اس میں

کوئی مسلح جنگ نہیں قائم ہو سکتی جب تک کہ میدان میں فاطمہؑ اور گھر میں علیؑ ہیں۔ اب فاطمہؑ کا اقدام یا تو اجماع کو توڑ دے گا یا کم از کم حدود نزاع و بحث سے آگے نہ بڑھے گا۔ اور اس طرح فاطمہؑ پر فتنہ کا الزام نہیں آسکتا۔

اس وقت امامؑ نے چاہا کہ اپنی آواز فاطمہؑ کی زبان سے سنائیں اور خود میدان معرکہ سے دور رہ کر اس وقت کا انتظار کریں جب کہ قیام کر کے کچھ فائدہ حاصل کر سکیں۔ امامؑ نے یہ بھی چاہا کہ امت کے سامنے قرآن سے یہ ثابت کر دیں کہ فاطمہؑ کا مقابلہ خود ہی بطلان خلافت کی واضح دلیل ہے۔ امامؑ نے جو چاہا تھا وہ حاصل ہو گیا۔ جب فاطمہؑ نے ان کی شخصیت کی وہ صحیح ترجمانی کی جس کے وہ اہل تھے۔

فاطمی مقابلہ کے مناظر

فاطمی معارضے کا خلاصہ ان مناظر میں مضمر ہے :-

(۱) فاطمہؑ نے ایک شخص کو بھیجا کہ ابوبکر سے مسائل میراث میں بحث کرے اور ان کے حقوق کا مطالبہ کرے۔ یہ فاطمہؑ کا پہلا تمہیدی قدم تھا جس کے بعد وہ میدان میں آنے والی تھیں۔

(۲) فاطمہؑ خود ابوبکر کے سامنے آئیں اور چاہا کہ اپنی طلب میں شدت سے کام لیں تاکہ خلیفہ کی قوت مخاصمت کا صحیح اندازہ ہو سکے۔

بعض حضرات نے خیال ظاہر کیا ہے کہ مطالبہ کی ترتیب میں پہلے دعویٰ عطیہ تھا اس کے بعد دعویٰ میراث لیکن میرا خیال یہ ہے کہ اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

بلکہ بہت ممکن ہے کہ پہلے دعویٰ میراث ہی رہا ہو اس لیے کہ روایت میں تصریح ہے کہ نمائندہ فاطمہؑ نے صرف میراث کا مطالبہ کیا تھا۔ اور اس کی نمائندگی کی شان تابتی ہے کہ یہ پہلا قدم تھا جبکہ فطرتاً مقابلہ تدریجی ہوتا ہے اس کے علاوہ کہ دعویٰ ارث کا اثبات زیادہ آسان تھا اس لیے کہ توارث سے ابتداء کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے اسلیے کہ اسی میں فدک بھی داخل ہے جیسا کہ خلیفہ کے انکار عطیہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ مطالبہ میراث میں اور دعویٰ عطیہ فدک میں کوئی تضاد ہی نہیں ہے۔ اسلیے کہ مطالبہ میراث عام ترکہ نبیؐ سے متعلق تھا نہ کہ خاص فدک سے۔ اور مطالبہ عطیہ فدک ہی سے متعلق تھا۔

(۳) وفات پیغمبر اسلامؐ کے دس دن کے بعد فاطمہؑ نے مسجد میں خطبہ دیا۔ (شرح نہج البلاغہ معتزلی)

(۴) فاطمہؑ کی ابوبکر و عمر سے گفتگو جب وہ عذر کرنے کے لیے آئے اور آپ نے کہہ دیا کہ میں غضبناک ہوں اور اس سے خدا و رسولؐ بھی ناخوش ہیں۔
(الامامۃ والسیاسۃ ص۱۴)

(۵) فاطمہؑ کا وہ خطبہ جو انھوں نے نساء مہاجرین و انصار کے درمیان ارشاد کیا تھا۔

(۶) فاطمہؑ کی وصیت کہ میرے دشمن میرے جنازہ میں شریک نہ ہوں۔
(حلیۃ الاولیاء ج ۲ ص ۴۳۔ مستدرک حاکم ج ۳ ص ۱۶۲ اسد الغابہ ج ۵ ص ۵۲۴)
(یہ اعلان آخر تھا فاطمہ زہراؑ کی خلافت حاضرہ سے مخالفت کا۔)

فاطمہؑ کی ناکامی اور کامیابی

فاطمی اقدام ایک اعتبار سے ناکام رہا اور ایک اعتبار سے کامیاب۔

ناکام اسلیے رہا کہ فاطمہؑ نے اپنے آخری جہاد میں جو کہ وفاتِ پیغمبرؐ کے دسویں روز بذریعہ خطاب کیا تھا حکومتِ وقت کو تباہ و برباد نہ کر سکیں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ فاطمہؑ اس میدان میں ناکام کیوں ہوئیں۔ البتہ اتنا ضرور معلوم ہے کہ اس ناکامی میں خلیفہ کی شخصیت کا بڑا ہاتھ ہے۔ اس لیے کہ وہ سیاسی چالوں میں بڑے استاد تھے۔ انہوں نے فاطمہؑ کا مقابلہ اس ہنرمندی سے کیا کہ جس کا مظاہرہ فاطمہؑ کے کلام کے جواب اور انصار کے مجمع کے خطبے سے ہوا۔ ایک طرف تو فاطمہؑ کے جواب میں آنسو بہہ رہے تھے اور دوسری طرف دل میں آگ بھڑک رہی تھی کہ فاطمہؑ سامنے سے ہٹ جائیں تو انصار کو مطمئن کیا جائے جیسا کہ ہوا۔ فاطمہؑ کے مسجد سے نکلتے ہی خطبہ شروع ہو گیا: "تم لوگ ہر ایک کی بات سُن لیتے ہو یہ علیؑ کی ترویج کرنا چاہتی ہیں جو کہ فتنوں کا مرکز ہیں۔ الخ۔" رقت و گریہ سے غضب و غیظ کی طرف فوری انتقال یہ بتاتا ہے کہ خلیفہ کو حالات بدلنے کی چالوں پر پورا عبور حاصل تھا۔ اور وہ وقتی طور سے بہترین تمثیلیں بنا سکتے تھے۔

فاطمہؑ کامیاب اس طرح ہوئیں کہ انھوں نے حق کو ایک لازوال طاقت دے دی اور باطل کو نیست و نابود کر دیا۔ فاطمہؑ کی کامیابی کا اظہار اس وقت ہوا جب دونوں معذرت کے لیے گئے اور فاطمہؑ نے کہا کہ ایک حدیث کی گواہی دو۔ میرے باپ نے فرمایا ہے کہ "فاطمہؑ کی رضا میری رضا ہے اور فاطمہؑ کا غضب میرا غضب۔ جو

اس کا دوست وہ میرا دوست۔ جو اس کا دشمن وہ میرا دشمن"۔ اور ان دونوں نے گھبرا کر تصدیق کر دی تو فاطمہؑ نے اعلان کر دیا خدا و ملائکہ شاہد ہیں کہ تم لوگوں نے مجھے ناراض کیا۔ میں بابا سے تمہاری شکایت کروں گی ع۱ (بخاری و مسلم)

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ فاطمہؑ نے اپنے اعتراض کو مستحکم کرنے کے لیے کس قدر اہتمام کیا تھا تاکہ اس نزاع سے ایک دائمی نتیجہ حاصل کریں۔ تاکہ افکارِ فاطمی کی وضاحت ہو جائے۔ اور ان کے نظریات معلوم ہو سکیں۔ فاطمہؑ کا اعتقاد یہ تھا کہ میرا حاصل کردہ نتیجہ دین و عقیدہ کے حساب میں بڑا قیمتی ہے اور وہ یہ کہ صدیق مستحق غضب الٰہی و غضب رسولؐ ہیں۔ انھوں نے خدا اور رسولؐ کو اذیت دی اور ان کو ناخوش کیا اور ظاہر ہے کہ ایسا انسان مستحق خلافت و امامت ہرگز نہیں ہو سکتا۔ قرآن کہتا ہے "مسلمانوں تمہیں خدا اور رسولؐ کو اذیت دینے کا کوئی حق نہیں ہے۔ جو لوگ خدا اور رسولؐ کو اذیت دیتے ہیں وہ دنیا اور آخرت میں مستحق لعنت ہیں۔ جو رسولؐ کو اذیت دے وہ مستحق عذاب الیم ہے"

اے اہل ایمان ان کو ولی نہ بناؤ جن پر اللہ کا غضب ہے۔ جن پر اللہ کا غضب ہے وہ گمراہ ہیں"۔

ع۱ صحیح بخاری ج ۵ ص۲۲، صحیح مسلم ج ۴ ص۲۶۱ مستدرک حاکم ج ۳ ص۱۵۴ ذخائر العقبیٰ ص۳۹ صواعق محرقہ ص۱۰۵ مسند احمد ج ۴ ص۳۲۸ ترمذی جلد ۲ ص۳۱۹ ابن ماجہ ج ۱ ص۲۱۶

ع۲ صحیح بخاری ج ۵ ص۸ ج ۶ ص۱۹۶، مسلم ج ۲ ص۷۲ مسند احمد ج ۱ ص۶ تاریخ طبری ج ۳ ص۲۰۲ کفایۃ الطالب ص۲۲۶ سنن بیہقی ج ۶ ص۳۰۰۔

۴۔ اقتباسات کلام فاطمی

یوم جائت الی عدی وتیم
ومن الوجد ما اطال بکاھا

یاد کرو اس دن کو جب بنت رسولؐ بنی عدی وتیم کے افراد کے پاس اس عالم میں آئیں کہ اُن کے آنسو برابر بہہ رہے تھے۔

تحظ القوم فی اتم خطاب
حکت المصطفیٰ بہ وحکاھا

وہ قوم کو ایسا بہترین موعظہ کر رہی تھیں کہ گویا وہ پیغمبرؐ کی نقل کر رہی تھیں یا پیغمبرؐ ان کی حکایات کر رہا تھا۔

"الازری"

عظمت پیغمبرؐ روحانی منازل میں

ہم اس مقام پر خطبہ جناب فاطمہؑ زہرا کے چند اقتباسات نقل کر رہے ہیں تاکہ ان کی باقاعدہ تحلیل وتوضیح کی جائے اور یہ سمجھا جائے کہ اس کلام سے شہزادی عالمؑ کا حقیقی مقصد کیا تھا؟ آپ فرماتی ہیں" اللہ نے پیغمبرؐ کو

کمال شفقت ومحبت ورغبت وایثار کے ساتھ اپنے پاس بلالیا۔ اب پیغمبرؐ کو تعب دنیا سے راحت مل گئی۔ ان کے گرد ملائکہ ابرار، ان کے سر پر رحمت غفار اور ان کے جوار میں ملک جبار ہے۔"

ذرا دیکھو تو! اس بلیغہ نے کیوں کر تمام مادی نعمتوں کا ذکر چھوڑ کر فردوس باقی اور جنت وخلد کا تذکرہ شروع کر دیا۔ یہ عورت سمجھتی ہے کہ میرے باپ کی منزل ان نعمتوں سے اجل وارفع ہے۔ لذت مادی خواہ وہ کیسی ہی عظیم ہو اس محمدؐ کی نظر میں جو روحانیت کا علم بردار تھا۔ جس کی منزل کمال تک کوئی دوسرا انسان نہیں پہنچ سکتا بالکل ہیچ ہے۔ فاطمہؑ کی تربیت اس مصلح اعظم کے ہاتھوں سے ہوئی جو عقیدۂ الٰہیہ کا حامل تھا۔ وہ عقیدہ الٰہیہ جو فکری پرواز کی آخری منزل اور طوافِ انسانیت کا آخری دور ہے[1] جہاں پہنچ کر ضمیر کو سکون اور روح کو دولت ایمان حاصل ہو جاتی ہے۔ رسول اکرمؐ! وہ روحانیت کا مربی ہے اور روحانیت کا قائد اعظم جس کے جھنڈے کے سایہ میں روح نے مادی قوتوں کو نیست ونابود کر دیا۔ جب محمدؐ اس میدان کا مجاہد اکبر ہے جہاں مادہ وروح کی فیصلہ کن جنگ ہوتی ہے تو پھر کیا تعجب ہے اگر محمدؐ عربی کو عالم روحانیت کا محور قرار دیا جائے۔ اور افلاک روح کی گردش ان کے اشاروں پر مانی جائے جیسا کہ فاطمہؑ زہرا نے اظہار کیا کہ محمدؐ عربی کے گرد ملائکہ رحمت جمع ہیں۔ گویا کہ یہ ذات دنیا وآخرت میں قطب کی حیثیت رکھتی ہے۔ فرق یہ ہے کہ دنیا میں پریشانی ہے اسلیے ابھی حیات انسانیت کی گردشوں کی اصلاح کر رہا ہے۔

---

[1] یہ فقرہ میں نے اپنی کتاب العقیدۃ الالٰہیہ فی الاسلام سے نقل کیا ہے۔

اور آخرت میں مطمئن ہے۔ اس لیے کہ ملائکہ استفادہ نور اُس مرکزِ انوار سے کرتے ہیں اسی لیے اس کے گرد جمع رہتے ہیں۔

جب پیغمبرؐ اس منزل کا انسان ہے تو اس کی جنت بھی ویسی ہی ہوگی۔ وہاں مادی نعمتوں کا کیا ذکر ہو سکتا ہے وہاں تو روحانی لذتیں اور پاکیزہ الطاف ہیں۔ اس سے بلند نعمت کیا ہو سکتی ہے کہ انسان ملکِ جبار کے ہمسایہ میں رہے اور اس کے سر پر سایہ رضوانِ الٰہی چھایا رہے۔

اس طرح فاطمہؑ اپنے باپ کی جنت کو دو لفظوں میں بیان کرتی ہیں۔ بنے جو مبدأ انوار سے متصل ہے اور یہ وہ آفتاب ہے جس کا ملائکہ نور احاطہ یے ہیں۔ پھر فرماتی ہیں تم جہنم کے کنارے پر تھے۔ ہر پیاسے کی نظر تم پر ہر طماع کا لقمہ تم تھے۔ لوگ تمھیں اپنے پیروں سے کچلتے تھے۔ تم گندہ پانی پیتے اور پتے چباتے تھے۔ تمھاری زندگی ذلت و خواری کی تھی۔ ہر وقت خطرہ لگا رہتا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ لوگ تمھیں گھیر کر ہلاک کر دیں۔ اللہ نے تمھیں ان مصائب سے محمدؐ عربی کے ذریعہ نجات دی۔ ان باتوں کے علاوہ جب پیغمبرؐ جانور جیسے انسان اور بھیڑیے جیسے عربوں میں مبتلا ہو گیا جن میں سرکش قسم کے اہلِ کتاب بھی تھے، جن کی آتشِ فساد کو کبھی اللہ نے بھڑکنے نہیں دیا۔ جب کبھی شیطان نے سر ابھارا یا مشرکین نے کوئی بے ادبی کی تو پیغمبرؐ نے اپنے بھائی کو سینہ سپر کر دیا۔ جس کی شان یہ تھی کہ جب تک فتنوں کے کان نہ بند کر دے اور جب تک آتشِ فساد کو اپنے تلوار کے پانی سے خاموش نہ کر دے میدان سے

پلٹتا نہ تھا۔ وہ ذاتِ خدا میں کوشاں، امرِ الٰہی میں جد و جہد کرنے والا رسول اللہؐ سے قریب، اولیاء خدا کا سردار، امت کا ناصح عمل کے لیے کمربستہ، اسلام کے لیے ساعی اور ترویج دین کے لیے جفاکش تھا۔ ان تمام شدائد میں تم فارغ البال اور مطمئن تھے۔ تم کو کوئی گزند نہ پہنچا۔ [1]

فاطمی موازنہ امامؑ و اغیار کے درمیان

کیا عجیب مقابلہ ہے اس شخصیت کے درمیان جس کو فاطمہؑ زہرا نے دنیائے اسلام کی قوت عسکریہ کا ماحصل قرار دیا ہے اور اس کے درمیان کہ جو ملکہ شجاعت اور قوائے عسکریہ سے یونہی جدا تھا جیسے شیرِ مادر سے بچہ۔ اس مقدس ذات کے درمیان جس کی شجاعت کے نعرے آسمانوں میں لگائے گئے۔ جس کے کارنامے فہرست مثالیات میں دوامی حروف سے لکھے گئے۔ اور اُس شخصیت کے درمیان جو میدانِ جہاد سے الگ رہ کر ہمیشہ عریشہ میں پناہ گزیں رہے اور کاش اتنا ہی ہوتا اور وہ فرار نہ اختیار کیا جاتا جو قربانی اور آداب فداکاری کے میدانوں میں حرام محرم قرار دیا گیا۔

ہم نے تاریخ انسانیت میں اس نجم صحابیت کا کوئی کارنامہ ایسا نہیں دیکھا جو قابل ذکر ہو۔ برخلاف میدانِ جہاد میں علوی کارناموں کے اس لیے کہ امامؑ

---

[1] اس کلام سے فاطمہؑ زہرا کی مراد اس وقت کی حاکم جماعت ہے جیسا کہ ہم آئندہ واضح کریں گے۔

کے مواقف میدان جہاد و قتال میں ایسے ہیں جنھیں دنیائے اسلام نے اپنا مرکز اور تاریخ مذہب نے اپنی سُرخی قرار دیا ہے۔

علیؑ تاریخ نبوت کے لحظہ اوّل کا مسلم اوّل ہے۔ اس وقت جب صوت رسالت دہنِ پیغمبرؐ سے نکلی اس کے بعد علیؑ ہی وہ غیور اور مدافع ہے جس کے حوالہ کفار سے تصفیہ حساب آسمان سے کیا گیا۔

استحقاق خلافت کے بارے میں امامؑ کی کامیابی دو جہتوں سے ہے۔

(۱) یہی وہ بے مثل سپاہی ہے جس نے جملہ مسلمانوں کے آگے میدان جہاد میں اس وقت قدم جمائے جب میدان جہاد کو سیاسی مرکزیت سے الگ نہیں کیا گیا تھا۔

(۲) امامؑ کا بے مثل جہاد اس اخلاص کامل کی دلیل ہے جس میں شک کی گنجائش نہیں۔ اور حرارتِ ایمانی کا یہی وہ بھڑکتا ہوا شعلہ ہے جو تا قیامت خاموش نہیں ہو سکتا۔ اخلاص کامل اور حرارت ایمانی یہ دو بنیادی شرطیں ہیں اسی شخصیت کے لیے جو مسند حکومت پر بیٹھ کر امت اسلامی کی حفاظت کا دعویدار بنے۔

آپ حیاتِ رسولؐ اور جہاد رسولؐ کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ علیؑ ہی کی وہ ذات ہے جس نے اپنی مواسات سے زمین و آسمان کو مدہوش کر دیا[1] اور صدیق ہی

---

[1] تاریخ طبری میں ابن رافع سے منقول ہے کہ جب علیؑ ابن ابی طالب علمبرداروں کو تہ تیغ کر چکے تو رسول اکرمؐ نے ایک جماعت مشرکین پر حملہ کرنے کا حکم دیا۔ علیؑ نے انھیں بھی قتل کر دیا۔ پیغمبر اکرمؐ نے دوسری جماعت پر حملہ کا حکم دیا (باقی حاشیہ صفحہ پر)

کی وہ ذات ہے جس نے اس مرکز قیادت میں پناہ لی جو مسعود پہلوانوں کے حلقہ میں گھرا ہوا تھا[1]۔ اور یہی وہ شخصیت ہے[2] جس نے روز احد فاروق[3] کے ساتھ فرار اختیار کیا اور دست پیغمبر پر موت کے لیے بیعت نہیں کی۔ تاریخ مسلمین[4] بتاتی ہے کہ شہادت کے لیے دست رسولؐ پر آٹھ آدمی ۳ مہاجر اور ۵ انصار نے بیعت کی تھی لیکن ان میں

(بقیہ صفحہ ۹۳) ۔ علیؑ نے اسے بھی فی النار کیا تو جبرئیل نے آ کر عرض کی یا رسول اللہ یہ مواساۃ ہے۔ آپ نے فرمایا کیوں نہ ہو وہ مجھ سے ہے اور میں اس سے ہوں۔ جبرئیل بول اُٹھے اور میں آپ دونوں سے۔ لا فتی الا علی لا سیف الا ذوالفقار آپ ذرا غور کریں کہ پیغمبرؐ نے مواساۃ سے دوئت کی طرف کس طرح توجہ فرمائی۔ اس لیے کہ مواساۃ تعداد اور دوئی پر دلالت کرتی ہے۔ پیغمبرؐ نے نہ چاہا کہ مجھ میں اور علیؑ میں تعداد اور دوئی رہے اسلیے اپنا جزو بنا لیا تاکہ دنیائے مواساۃ تا قیامت علیؑ کے کردار کو شمع راہ اور مثال انسانیت اور معراج ارتقاء قرار دیتی رہے۔ اب اس کے بعد بتائیں کہ کیا انصاف یہی ہے کہ جسے پیغمبرؐ اپنا جزو قرار دیں اس کے اور پیغمبرؐ کے درمیان تین اجنبی اشخاص کا فاصلہ قرار دے دیا جائے۔

[1] عیون الاثر ج ۱ ص ۲۵۸

[2] تاریخ اہل تشیع

[3] شرح نہج البلاغۃ ج ۲ ص ۲۸۹-۲۹۰

[4] شرح نہج البلاغۃ ج ۲ ص ۲۸۰

کہیں اس بلند شخص کا پتہ[1] نہیں ملتا۔

سوال یہ ہے کہ اگر حضور نے فرار اختیار نہیں فرمایا تو بیٹھے کیوں رہے؟ جب کہ جہاد اس وقت تک واجب رہتا ہے کہ جب تک دشمن کے مقابلہ کی پوری قوت جمع نہ ہو جائے۔ اور ظاہر ہے کہ ایسا نہیں تھا۔ ورنہ پیغمبرؐ اس قدر زخمی نہ ہوتے کہ بیٹھ کر نماز ادا کریں۔ یہ بات سب کو معلوم ہے کہ وسط میدان اور عرصہ جنگ میں آنے والا موت سے نجات نہیں حاصل کر سکتا جب تک کہ دو میں سے ایک راہ اختیار نہ کرے یا فرار کرے یا سب کے ساتھ دفاع کرے۔ اگر صدیق نے ان میں سے کوئی کام نہیں کیا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک دشمن دوسرے کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑا رہا اور اسے کسی نے قتل نہ کیا۔ کیا یہ کہا جائے کہ مشرکین رسولؐ و علیؑ وغیرہ سے نہ ڈرے اور صدیق سے ڈر گئے؟

میری سمجھ میں یہ فلسفہ نہیں آتا سوائے اس کے کہ یہ کہا جائے کہ صدیق نے جوار رسولؐ میں کھڑے ہو کر ایسی جگہ حاصل کر لی کہ جو خطرہ کے مقامات سے بقدر حاجت دور تھی۔ اس لیے کہ مجاہدین کی ایک جماعت اس کی حفاظت میں مشغول تھی۔

یہ بات کچھ بعید نہیں ہے اس لیے کہ ہم نے مذاق صدیق سے یہ سمجھ لیا ہے کہ وہ میدانِ جنگ میں رسولؐ کے پہلو میں رہنا زیادہ پسند کرتے تھے اس لیے کہ یہی وہ جگہ ہے جہاں جنگ کی تکالیف سے محفوظ رہنے کے اسباب مہیا رہتے تھے۔

آپ حیات امامؑ اور حیات صدیق دونوں کا مطالعہ کر کے ہمیں بتائیں کہ کیا

---

[1] شرح نہج البلاغۃ ج ۳ ص ۳۸۹

حیات امامؑ میں کسی مقام پر اخلاص کی خاموشی جذبہ قربانی کی کمی اور میدانِ جنگ میں راحت و اطمینان کی تلاش نظر آتی ہے۔ خوب دیکھ لیجئے! باقاعدہ نظر کیجئے انشاءاللہ ہر کارنامہ ایک دوسرے سے بہتر اور ہر قربانی دوسرے سے مافوق پائیں گے۔ یہ وہ شخصیت ہے جہاں باطل کا گزر نہیں۔ اس میں دوام و فکر کی اتنی ہی استعداد پائی جاتی ہے جتنی اس کے استاد محمد عربی میں۔ اس لیے کہ یہ اس کا نفس ہے[1]۔

اب زمانہ رسولؐ میں صدیق کی زندگانی بیان کریں۔ کیا اس میں سوائے ضعف عقیدہ اور ترک جہاد کے کچھ اور نظر آتا ہے۔ کبھی عریش میں پناہ گزیں اور کبھی پہاڑ[2] پر اُچکتے نظر آئیں گے۔ کبھی اُسامہ کے لشکر[3] سے جدا ہو کر پیغمبرؐ کے مقرر کردہ امیر کی مخالفت کرتے دکھائی دیں گے۔ کبھی خیبر میں بجائے فتح قلعہ قموص ہزیمت خوردہ نظر آئیں گے۔ جس کی داد شجاعت[4] ان کے وزیر اعظم حضرت فاروق دیں گے۔ اور مسلمانوں کو بزدلی[5] پر آمادہ کریں گے۔ یہاں تک کہ پیغمبرؐ کو کہنا پڑے گا۔ کل میں علم دوں گا۔ الخ اور

---

[1] اس کی واضح دلیل آیۂ مباہلہ ہے۔

[2] سیرۃ حلبیہ ج ۲ ص ۱۲۳ جس میں کہ ثابت قدم رہنے والوں میں آپ کا اسم شریف نہیں ہے رہ گیا فرار عمر تو اس پر صحیح بخاری کی روایت دال ہے جس کا راوی جنگ حنین کا ایک فراری ہے۔ وہ کہتا ہے کہ عالم فرار میں میں نے عمر کو دیکھا۔ پوچھا مسلمانوں کا کیا حشر رہا۔ فرمایا امر اللہ ہے۔ یہ واضح دلیل ہے کہ آپ فراروں میں تھے۔

[3] سیرۃ حلبیہ ج ۳

[4] مسند احمد ج ۵ ص ۳۵۳ مستدرک حاکم ج ۳ ص ۳۷ کنز العمال ج ۶ ص ۳۹۴

[5] یہ ہے مکمل تصویر شجاعت حضرت فاروق اعظم کی جن سے اسلام کی عزت وابستہ تھی۔

اس کلام سے ایک ایسی تعریض ظاہر ہوگی جس سے ہزیمت خوردہ اشخاص کے حواس اُڑ جائیں گے۔ اور علیؑ عظیم کی وہ شخصیت نمایاں ہوگی جو محب خدا و رسولؐ اور محبوب خدا و رسولؐ ہے (ملاحظہ ہو صحیح بخاری ج ۵ ص۱۸ مسند احمد ج ۵ ص۳۵۳)

اے مسلمانوں کے دونوں خلیفہ! کیا تمھارا پیغمبرؐ جس کی نیابت کے تم مدعی ہو وہ بھی ایسا ہی تھا؟ کیا تم نے پیغمبرؐ سے جہاد اور راہِ خدا میں قربانی کے درس نہیں حاصل کیے؟ کیا اتنی مدت تک صحبت پیغمبرؐ میں رہنے کے بعد بھی تم میں کوئی جذبہ ایسا نہ پیدا ہوا جو تمھیں فرار سے روکتا؟ کیا تم نے قرآن نہیں سنا جس نے تمھارا فریضہ حفاظت پیغمبرؐ اور نشر احکام اسلامی قرار دیتے ہوئے کہا ہے "جو میدان سے بلا ضرورت بھاگ جائے اس پر غضب خدا ہے اور وہ شخص جہنمی ہے"؟

شاید آپ یہ کہیں کہ صدیق و فاروق کا مقام اس سے اجل ہے کہ وہ فرار محرم کو اختیار کریں۔ شاید انھوں نے کوئی عذر پیدا کر لیا ہو اس لیے کہ ان کے اختیار میں تاویل کی گنجائش بہت زیادہ تھی۔ جیسا کہ خالد ابن ولید کے واقعہ

عل میرا خیال ہے کہ وہ لشکر جو علیؑ کے ساتھ گیا تھا یہ وہی سابق کا ہزیمت خوردہ لشکر تھا اور اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ قائد لشکر کی شخصیت کا لشکر پر کتنا اثر پڑتا ہے۔

وہ فوج جس کی کمزوری کا کل فاروق نے اعلان کیا تھا آج اسی میں وہ پہلوان نکل رہے ہیں جن کے قدم میدان سے اکھڑتے ہی نہیں۔ صرف اسی لیے کہ قائد کے ثبات قدم نے ان کے اجسام میں روح استقلال و استقامت پھونک دی ہے۔

سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے مسلمانوں کو عمداً قتل کیا اور صدیق نے کہہ دیا یہ ایک اجتہادی غلطی ہے۔ ہم اس عذر کو قبول کیے لیتے ہیں اگر ہمارے سابقہ بیان کردہ وقائع قبول عذر کی اجازت دے دیں۔ (ملاحظہ ہو تاریخ ابن شحنہ بر حاشیہ کامل ج ۱۱ ص۱۱۴)

اعلان فاطمی سیاست وقت کے متعلق

جناب فاطمہؑ زہرا فرماتی ہیں "تم ہمارے شدائد کے منتظر اور ہمارے اخبار کے متلاشی تھے۔"

اس خطاب کا رُخ حاکم وقت جماعت کی طرف ہے اس لیے کہ اسی نے وہ خیال قائم کیا تھا جس پر فاطمہؑ زہرا نے تنقید کی ہے۔ اور وہ ہے بیعت میں جلد بازی کا عذر خوف فتنہ۔ یہ خطاب اس جماعت کے لیے ایک صریح اتہام ہے کہ یہ لوگ حکومت کے خواہاں اور جویا تھے اور اسی کے لیے برابر تدبیریں کیا کرتے تھے اور ایسے خطوط معین کر رہے تھے جو مطلب تک پہنچا دیں۔ اور ایک ایسے وقت کے منتظر تھے کہ جس میں تخت خلافت پر قابض ہو کر بیعت ہاشمی کو اس کے منصب قدیمی سے ہمیشہ کے لیے محروم کر دیں۔ پہلے ہم ثابت کر چکے ہیں کہ صدیق، فاروق اور عبیدہؓ میں خفیہ سازش تاریخی

عل مجھے ابو عبیدہ معاف فرمائیں کہ میں نے انھیں کسی لقب سے یاد نہیں کیا۔ اور یہ میری خطا نہیں ہے بلکہ اس اجل کی ہے جس نے ان تک خلافت پہنچنے نہ دی اور انھیں بھی لوگ کسی دکسی لقب سے سرفراز ضرور کرتے۔ رہ گیا لقب امین ظاہر ہے کہ اس کا پیغمبرؐ سے کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ یہ صرف سیاست وقت کے مصالح کی بنا پر تھا لہٰذا اسی کے ساتھ ختم ہو گیا۔

شواہد کی بنا پر مسلمات میں سے ہے۔ ہم اپنے مقصد پر کلام معصومؑ سے بہتر کوئی دلیل نہیں چاہتے اس لیے کہ وہ اس دور کی معاصر ہیں۔ وہ حوادث وقت کو اُن نقاد اور مبصرین سے بہتر سمجھ سکتی ہیں جو کہ ہزارہا سال کے بعد دنیا میں تاریخی انسانوں پر اپنی تحقیقات کی بنیاد قائم کریں گے۔

حق یہ ہے کہ اگر علیؑ کو الگ کر دیا جائے تو بظاہر اس حزب حاکم کا انکشاف سب سے پہلے فاطمہؑ نے کیا ہے اور انہیں نے اس کو خواہش سلطنت سے متہم قرار دیا ہے۔ اس کے بعد ان کے معاصرین، امیر المومنینؑ و معاویہ بن ابو سفیان وغیرہ میں جرأت اظہار اتہام پیدا ہوئی۔ جب تک یہ جماعت جس کے وجود کا فاطمہؑ کو یقین ہے۔ اور جس کی طرف امامؑ اور معاویہ نے اشارہ کیا ہے تخت حکومت اور امور امت پر قابض رہے گی اور جب تک کہ بعد میں آنے والی نسلیں اسی اصول سیاست کو اپنی حکومت میں صرف کریں گی۔ اور اسی متہم پارٹی کو اپناتی رہیں گی جس نے دنیائے اسلام کو تباہ و برباد کر دیا ہے۔ اور اس وقت تک ہم تاریخ عام میں اس جماعت کی صحیح تشکیل کا پتہ نہیں لگا سکتے جس کی پشت پر کام کرنے والے بڑے بڑے بہادر لوگ تھے جن کا شغلہ یہ تھا کہ وہ حکومت کے کردار کو شرعی رنگ میں رنگ دیا کریں۔

تصریح صدیقہؑ خلافت ابوبکر اور فتنہ کبریٰ کے متعلق

آپؑ فرماتی ہیں تم نے غیر کے اونٹ کو نشان لگا دیا اور دوسرے کے چشمہ پہ وارد ہو گئے۔ حالاں کہ ابھی زمانہ قریب کا ہے اور زخم کشادہ ہے جراحت کا اندمال نہیں ہوا رسولؐ دفن نہیں ہوئے۔ جلدی صرف خوف فتنہ کے نام پر کی گئی حالانکہ

تم فتنہ میں واقع ہو گئے۔ اور جہنم تو بہر حال کفار پر محیط ہے۔"

"یہ سب تدبیریں دودھ کے لیے کی گئیں جو آخر کار خون بن گیا اور یہی مین خسارہ ہے۔ اب تابعین کو اُن کے پیشواؤں کے کرتوت کا علم ہوگا۔ اب خوب خوش ہو عنقریب تم پر چمکتی تلوار، امنڈتے مشکلات، بے پناہ استبداد کا غلبہ ہوگا جو تم کو تباہ و برباد کر دے گا۔ افسوس صد افسوس تمہارے حال پر"

اگر صدیق اور ان کے ساتھی ایک خاص قسم کا گروہ بنا بھی رہے تھے تو ہمیں اُن سے اس امر کی امید نہیں تھی کہ وہ اس کے خطوط نمایاں کریں گے یا اُس کے نتائج کا کوئی اعلان کریں گے۔ لیکن اس کے باوجود ہمیں اُن نتائج کے سمجھنے کی ضرورت ہے۔

اتنا ضرور دیکھا گیا ہے کہ روز سقیفہ ان لوگوں نے بیعت میں بڑی جلد بازی سے کام لیا۔ اور سلطنت کے لیے اُسی طمع و حرص کا مظاہرہ کیا جس کی توقع اس وقت کے صحابہ کرام سے نہ تھی اس لیے کہ اُس دور کے انسان اکمل و عاقل تھے جن کی فکر صرف رواج اسلام اور حفظ شخصیت اسلامی سے متعلق تھی۔ ملکیت شخصی اور اقتدار پرستی جیسی باتیں تلامذہ محمد عربی سے بہت بعید ہیں۔

حکام نے بھی اس امر کا احساس کیا کہ ان کی اپنی حرکتیں اصول اسلام سے بعید اور شان صحابیت سے بالکل بیگانہ ہیں۔ لہٰذا ان لوگوں نے چاہا کہ اپنے کردار میں بلند مقاصد کا پیوند لگا دیں اور خوف فتنہ کے نام سے ان کی عیب پوشی کریں۔ لیکن انہیں یہ خیال نہ رہا کہ پیوند سے لباس رسوا ہو جاتا ہے اور بے ربط رفو کپڑے کو بدنما بنا دیتا ہے۔ اسی لیے فاطمہؑ زہرا نے اپنے دائمی کلمات سے اعلان کر دیا۔

"یہ لوگ جس فتنے سے بچنے کے نام پر سب کر رہے ہیں اسی میں بالآخر گر پڑے اور جہنم

ان کا حقیقی مرکز ہے حقیقتاً یہ فتنہ ہے بلکہ اُم الفتن ہے۔

کیا کہنا تیری بلاغت کا اے بضعۃ النبیؐ تو نے ایک تلخ حقیقت کو بے نقاب کر دیا۔

اور اپنے باپ کی اُمت کے سامنے اس وحشتناک مستقبل کو پیش کر دیا جس میں سُرخ بادل چھائے ہوئے نظر آتے ہیں۔ میں کیا کہوں؟ اب تو خون کی ندیاں بہیں گی جس میں انسان ڈوبتے نظر آئیں گے اور فاطمہؑ سلف صالح سے اب مصائب کی فریادیں سنا کریں گی کہ یہ لوگ فتنہ میں مبتلا ہو گئے اور ان کا انجام جہنم ہے۔ [illegible] بہ تنہا فتنہ ہے بلکہ لاریب ام الفتن ہے۔

اس سیاست کو کم از کم فاطمہؑ کی نظر میں فتنہ ہی ہونا چاہیے اس لیے کہ یہ اس ہارون محمدیؐ کے خلاف چلی گئی ہے کہ جس کی ذات گرامی میں حکومت اسلامی کے جملہ توانین جلوہ گر نظر آتے ہیں[1]۔

عجیب مذاق ہے کہ عمر اپنی کرتوت کا عذر خوف فتنہ کو قرار دیتا ہے اور اسے یہ خبر نہیں کہ خلاف منشاء[2] خدا اور رسولؐ حقدار سے خلافت چھین کر غیر مستحق کو دے

[1] نص حدیث غدیر کہ جسے ۱۱۰ صحابہ ۸۴ تابعین اور ۳۵۲ مؤلفین اہل سنت نے نقل کیا ہے۔ ملاحظہ ہو الغدیر علامہ امینی۔ یہ یاد رہے کہ قرآن کے اکثر اجزا کے لیے اتنی روایات نہیں ہیں جتنی حدیث غدیر کے لیے ہیں۔ لیکن اس میں شک قرآن کے انکار کے مترادف ہے۔ البتہ اس حدیث کی خلافت پر دلالت تو اسے کتاب "مراجعات" علامہ عبدالحسین شرف الدین میں ملاحظہ فرمائیں۔

[2] شرح نہج البلاغہ جلد ۳ ص ۱۱۴، ۱۱۵

دینا یہ بھی ایک فتنہ ہے۔ بلکہ اس لفظ میں جتنا عظیم مفہوم پوشیدہ ہو سب کا مستحق ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر ان لوگوں کو فتنہ کا خوف تھا اور یہ حکومت کے طالب نہیں رہے تھے مگر اس مقدار میں کہ جو اسلام کے لیے اصلح ہو، تو انھیں کس بات نے اس امر سے روک دیا تھا کہ رسول اکرمؐ سے خلیفہ کے متعلق سوال کرتے یا اُن سے خواہش کرتے کہ آپ اپنے بعد کے لیے مرجع اعلیٰ مقرر کر دیں۔ حالاں کہ پیغمبرؐ کا مرض الموت کافی دیر تک رہا اور آپؐ نے بارہا اپنے موت کی خبر بھی دی بلکہ لوگوں نے غسل وکفن[1] کی ترتیب پوچھی تھی، کیا یہ اسلام کا اساسی مسئلہ کسی کے ذہن میں نہ آیا؟ کیا کسی دل میں یا حضرت عمر خائف فتنہ کے دل میں بھی یہ خیال پیدا ہوا کہ ان فتنوں کے دفع کرنے[2] کا کوئی حل معلوم کر لیں، جن کو خود رسول اکرمؐ نے شب تاریک سے مشابہ قرار دیا ہے؟ حتیٰ کہ ادھر پیغمبرؐ کی روح اقدس نے قفس عنصری سے پرواز کی اُدھر مسلمانوں کے احساسات اور ان کی اسلامی غیرت میں ہیجان پیدا ہو گیا اور ان کے دل خوف فتنہ سے بھر گئے۔ میرا تو عقیدہ ہے کہ ان میں سے کوئی بات نہ تھی۔ صرف بات یہ تھی کہ پیغمبرؐ سفینۂ اسلام کا ناخدا پہلے ہی مقرر کر چکے تھے اسی لیے امت نے سوال کا کوئی محل نہ دیکھا۔

ان باتوں کو چھوڑنے اور پوچھنے کے لیے جو عذر چاہیے تراشیے لیکن اسے کیا کیا جائے کہ یہ اسلام کے غیور اصحاب بجائے سوال کرتے کہ پیغمبرؐ اگر بیان بھی کرنا

[1] تاریخ ابن اثیر ج ۲ ص ۱۲۳

[2] العقد الفرید ج ۲ ص ۱۷

چاہتا ہے تو اسے روک دیتے ہیں۔ حالانکہ جانتے ہیں فتنہ بھی ایک گمراہی ہے جس کے دفع کے لیے پیغمبرؐ نے قلم و کاغذ طلب کیا ہے۔ کیا یہ کہا جائے کہ یہ لوگ تحفظ اسلام اور خاتمہ فسادات پر نبیؐ اسلام سے زیادہ قادر تھے؟

میرا دل چاہتا ہے کہ ناظرین سے سوال کروں کہ رسول اکرمؐ کی مراد ان فتنوں سے کیا تھی جن کا تذکرہ آخر عمر میں آنحضرتؐ نے بقیع میں مردوں سے خطاب کر کے فرمایا تھا۔ آپ فرماتے ہیں "تم خوش قسمت تھے جو گزر گئے۔ اب وہ فتنے آ گئے ہیں جو مثل شب ہائے تاریک سیاہ ہیں۔ (ملاحظہ ہو تاریخ کامل ج ۲ ص ۱۲۲)

شاید آپ کہیں کہ اس سے مراد فتنہ مرتدین ہے۔ میں اس بات کو قبول کر لیتا اگر مدفونین بقیع میں ارتداد کا احتمال ہوتا۔ حالانکہ یہ غیر ممکن بات ہے وہ صالحین اور متقین کی منزل ہے۔ وہاں مرتدین کا کیا گزر؟ اور اگر وہ مراد نہیں تو پھر ان کی خوش قسمتی کیا ہے کہ وہ نہ رہے۔

ممکن ہے کہ کوئی خیال کرے کہ اس سے مراد وہ اموی چالیں ہیں جو عثمان و معاویہ نے اختیار کیں۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ یہ خلاف منطق ہے اس لیے کہ یہ بے عنوانیاں تیس اور ۳۵ کے بعد پیدا ہوئیں اور پیغمبرؐ یہ کہہ رہا ہے کہ فتنے آ گئے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اُن کو زمانہ رسولؐ سے متصل ہونا چاہئے۔ اب یہ دیکھئے کہ مراد پیغمبرؐ یہی فتنے ہیں جو بعد رسولؐ بلا فاصلہ پیدا ہوئے جس کو بقیع میں دفن ہونے والوں سے خاص ربط ہے۔ اور یہی وہ فتنہ ہے جس کے متعلق فاطمہؑ زہرا نے فرمایا ہے کہ لوگ فتنے میں گر پڑے۔ جب کسی شے کو رسول اکرمؐ فتنہ کہیں تو اب ہمارے لیے کیا مانع ہے کہ ہم اس امر کو دنیائے اسلام کا فتنہ اول قرار نہ دیں۔

اس وقت کی کاروائی ایک دوسرے اعتبار سے بھی فتنہ تھی اور وہ یوں کہ خلافت ایک ایسی امت کے لیے طے کی گئی جس میں چند معمولی افراد ہی اس سے راضی تھے۔ جنھیں حکومت کے امور سلطنت کے دستور میں کسی قسم کا دخل دینے کا کوئی حق نہیں ہوتا ہے۔ یہی خلافت صدیق ہے کہ جب وہ سقیفہ کے باہر نکلے تو عمرؓ ان کے آگے آگے اُچک رہے تھے اور اس قدر چلا رہے تھے کہ منھ سے جھاگ نکل آیا۔ ان کے ساتھ ایک جماعت تھی جو صنعانی چادریں اوڑھے ہوئے تھی۔ جس کے پاس سے گزرتے تھے اسے مخبوط الحواس بنا کر اس کا ہاتھ کھینچ کر ابوبکر کے ہاتھ پر رکھ دیتے تھے چاہے وہ راضی ہو یا ناراض ہو۔ اور یہی ان کی بیعت تھی۔ (شرح نہج البلاغہ معتزلی ج ۱ ص ۷۴)

اس کا مطلب یہ ہے کہ حکام نے مسلمانوں کے سامنے ایسی خلافت پیش کی کہ جو نہ آسمان سے بابرکت قرار پائی اور نہ اس سے مسلمان راضی ہوئے۔ نہ اس کی پشت پر نص رسولؐ تھی نہ اجماع امت۔ اس لیے کہ سعدؓ نے تا حیات بیعت نہیں کی اور بنی ہاشم نے بقول بخاری چھ مہینے تک۔ کہا جاتا ہے کہ اہل حل و عقد کی بیعت کافی ہے۔

کیا یہ مفہوم محتاج شرح و تفسیر نہیں ہے؟ یہ کس نے کہا کہ ابوبکر کی بیعت کرنے والے اہل حل و عقد تھے؟ یہ استعداد ان میں کس نے پیدا کی؟ یہ کام نہ تو نبیؐ نے کیا اور نہ امت نے! اس لیے کہ تاریخ بتاتی ہے کہ اہل سقیفہ نے قوانین انتخاب کی رو سے ایسی جماعت کا انتخاب ہی نہیں کیا جس کو حاکم اعلیٰ کے انتخاب کا حق ہو اور اسے اہل حل و عقد سے تعبیر کیا جا سکے۔ نہ رسولؐ نے کسی جماعت کو یہ لقب دیا ہے! بھلا یہ مسلمانوں کے لیے کیسے جائز ہو گیا کہ امور امت پر کسی کو حاکم اختیار کریں اس حالت میں کہ انھیں انتخاب کا حق ہو۔ اور نہ امت نے انھیں اس کام پر مقرر کیا ہو۔

کیا نظام الحکم فی الاسلام یہی ہے؟

اصطلاح سیاست میں یہ بڑی پرلطف بات یہ ہے کہ حاکم خود ہی اہلِ حل وعقد مقرر کرے اور پھر ان سے خود ہی انتخاب کرائے اس سے زیادہ لطیف یہ بات ہے کہ علیؑ وعباس وبنی ہاشم وسعد بن عبادہ وزبیر وعمار وسلمان وابوذر ومقداد اور جملہ اہل عقل والے (بقول ابن عباس۔ ملاحظہ ہو شرح نہج البلاغہ معتزلی ج ۲ ص ۱۱۵) کو اہل حل وعقد سے خارج کردیا جائے۔ (اگر یہ صحیح ہو اسلام میں کوئی طبقہ اہل حل وعقد کا بھی ہے۔)

اس کلمہ نے مسلمانوں کو مجبور کردیا کہ وہ اسلام کو نظام اشتراکیت کا نمونہ بنادیں جس کو اسلام سے کوسوں کا لگاؤ بھی نہیں ہے۔ حیف! صد حیف! کیا وہ بڑی بڑی دولتیں جن سے عبدالرحمن بن عوف اور طلحہ وزبیر کے خزانے بھرے ہوئے تھے ان کا کوئی سبب سوائے اس لقب کے کچھ اور بھی تھا۔ یہی وہ مبارک لقب تھا جس نے ان میں احساس برتری پیدا کردیا اور انھیں یہ خیال دلادیا کہ تم اُمت اسلامیہ کے جملہ اموال میں تصرف کے حقدار ہو۔ کہا جاتا ہے کہ حکومت شرعیہ کا معیار اکثریت ہے اور اسی قانون پر اساس حکومت کو قائم ہونا چاہیئے۔ مگر لطف یہ ہے کہ قرآن کریم نے اکثریت کا بڑا استخفاف کیا ہے اور اس نے کسی حالت میں بھی اکثریت کو معیار و میزان نہیں قرار دیا۔ جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے "اے رسولؐ اگر تم اکثر کا اتباع کروگے تو یہ تمھیں گمراہ کردیں گے"۔ اکثر حق کو بُرا سمجھتے ہیں۔ اکثر خیالات کا اتباع کرتے ہیں۔ اکثریت جاہل ہوتی ہے۔

صحاح ستہ میں رسول اکرمؐ سے روایت ہے۔ آپ فرماتے ہیں "جب میں

حوضِ کوثر پر کھڑا ہوں گا تو ایک جماعت آئے گی جسے میں پہچانتا ہوں گا۔ ایک شخص کہے گا کہ ان کی منزل جہنم ہے۔ میں سوال کروں گا۔ کیوں؟ جواب ملے گا یہ تمھارے بعد مرتد ہوگئے تھے۔ اب ان میں سے صرف چند اشخاص بچیں گے۔

ظاہر ہے اکثریت جہنمیہ اسلامی سلطنت کی بنیاد نہیں قائم کرسکتی اس لیے ایسی اکثریت کی خلافت بھی ایسی ہی ہوگی۔ اگر ہم اس اکثریت کو اہل مدینہ کی جہنمی کثرت میں محدود نہ کریں بلکہ یہ کہیں کہ اکثریت مسلمین خلافت کا معیار ہے تو پھر یہ دیکھنا پڑے گا کہ کیا مدینہ ہی مسلمانوں کا مسکن تھا کہ وہاں اکثریت کی رائے حاصل ہوگئی؟ یا ابوبکر نے خلافت کے لیے غیر مقامات پر خطوط لکھ کر ان کی رائے حاصل کی تھی؟

تاریخ بتاتی ہے کہ ایسا کچھ نہیں ہوا بلکہ پورے ملک والوں پر تو خلافت کا تسلیم کرنا یوں فرض کیا گیا کہ اس میں کسی شک وانکار کی گنجائش ہی نہ رکھی گئی۔ اور نہ اس کا موقع دیا گیا کہ کوئی کچھ پوچھ سکے۔ بلکہ بیعت میں تردد کو ایک ناقابل مغفرت جرم قرار دیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ خلافت بعض مسلمین کی بیعت سے حاصل ہوتی ہے اور یہ بات ابوبکر کو میسّر ہوگئی تھی۔ لیکن افسوس ہے کہ اس بات کو کوئی عقل سلیم اور منطق صحیح تسلیم نہیں کرتی۔ بعض مسلمین کو کون سا حق ہے کہ وہ تمام مسلمانوں کے سر پر حاکم بناکر مسلّط کردیں؟ بھلا یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ جملہ امور امت ایسے کمزور دھاگے میں معلق کردیے جائیں کہ جو کچا ہو اور امت کو اپنے احکام وقوانین کے تحفظ کے لیے ایسے شخص کی طرف موڑ دیا جائے کہ جس کو چند آدمیوں نے بنا کر کھڑا کردیا ہو؟ جس کی تعدیل وتوصیف نہ کسی نص نبوی نے کی نہ اجماع قوم نے۔ بلکہ یہ ایک عوام کی جماعت جن میں بعض وہ بھی ہیں کہ جن کو قرآن نے سند دی ہے کہ یہ پیغمبرؐ کو اذیت دیتے ہیں۔ خدا و رسولؐ سے

عہد کرتے ہیں کہ اب اگر اس کا فضل ہو گیا تو ہم صدقہ دیں گے اور صالح بن جائیں گے لیکن جب مل جاتا ہے تو بخل کرتے ہیں اور منہ پھیر لیتے ہیں ۔ آخر کار ان کے دلوں میں نفاق راسخ ہو جاتا ہے ۔ یہ وعدہ کے مخالف اور کاذب ہیں ۔ بعض وہ بھی ہیں جن کے باطن کی تعریف قرآن نے کی ہے " اہل مدینہ میں سے بعض وہ ہیں جو نفاق پر اڑے ہوئے ہیں ، اے رسولؐ تم نہیں جانتے لیکن ہم تو واقف ہیں "۔ ظاہر ہے کہ ایسی جماعت جس میں کچھ منافق ، کچھ موذی اور کچھ کاذب ہوں اُن کا انتخاب کرنا عامۂ مسلمین کے لیے واجب العمل اور قابل قبول نہیں ہو سکتا خواہ انھوں نے کسی بنیاد پر انتخاب کیا ہو ۔

اس سے بڑھ کر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ خلافت صدیق نہ خلافت نص تھی نہ اکثریت نہ وہاں کوئی انتخاب ہوا تھا نہ اختیار ۔ صرف اتنا ہے کہ اس کے پیچھے بعض لوگوں نے اپنی کوششیں صرف کیں ، بعض نے اس کے گرد ہجوم کر لیا ۔ مدینہ کی کچھ پارٹیوں نے ساتھ دے دیا اور اس طرح چند مسلمانوں کی خلافت تیار ہو گئی جن کا قول اس موضوع میں قطعاً ناقابل اعتبار ہے ۔ اس لیے کہ وہ حکومت جس کی قوتیں امت سے حاصل ہوں گی اس کا حاکم بھی امت کا نمائندہ اور اسی کا پورا پورا ترجمان ہو گا ۔ اور اس طرح اس کو اسلامی قوانین کی پابندی کا موقع نہ مل سکے گا ۔ دوسری بات یہ ہے کہ امت میں کچھ منافقین بھی ہیں جنھیں قرآن جانتا ہے ۔ اب اگر ہم یہ کہیں کہ اس اجتماع میں ایسا کوئی نہیں تھا تو اسکیلئے نص یا اجماع امت کی ضرورت ہو گی ۔

اگر مجھے صدیق اجازت دیں تو میں فاطمہؑ زہرا کی رائے کی طرف کچھ یا پورا پورا میلان ظاہر کر دوں ۔ اس لیے کہ ہم فتنہ کا ان سے بہتر کوئی تصدیق کرنے والا نہیں پاتے کہ ایک

شخص بلا وجہ قانون امت پر مسلط ہو جائے اور اس کے زمانہ حیات میں تفرق شروع کر دے جیسا کہ صدیق نے اپنی پوری خلافت میں یا کم از کم حشو و عمل میں یا پھر ہفتہ اول میں کیا جس کی تعبیر صدیقہ نے فتنہ سے کی ہے ۔

میں نہیں جانتا کہ وہ لوگ جنھوں نے ان عناصر کو چھوڑ کر جنھیں اس موضوع میں واقعی رائے دینے کا حق تھا ، اپنی استبدادی خلافت بنا لی تھی ۔ اُن کے ذہن میں یہ بات آئی تھی یا نہیں ؟ کہ یہ عناصر معارض ہوں گے ، بنی ہاشم مقابلہ کریں گے ! حالاں کہ یہ بات بڑی حد تک معقول تھی ۔ پھر ان لوگوں نے کیوں کر احتیاط نہیں کی اور وہ نتیجہ جو چند ساعتوں میں ملتا ہے اس تک مدتوں میں نہ پہنچ سکے ۔ ہم کیوں نہ اس موقف عظیم کی ویسی ہی تقدیس کریں جیسی کہ فاروق نے اسی وقت کی جب انھوں نے فرمایا کہ اب ایسا اقدام کرنے والا مستحق قتل و موت ہے ۔ اگر ہم اس کلام کو خیال کر کے کہ ایک امام امت کا قول ہے اس کی تحلیل کریں تو صاف معلوم ہو جائے گا کہ فاروق کی نظر میں خلافت صدیق فتنہ و فساد تھی ۔ اس لیے کہ قتل مسلم بغیر ان امور کے ناجائز ہے بلکہ یہ فتنہ ام الفتن ہے کہ جس نے سلطنت الٰہیہ کو ہر نیک و بد ، صالح و ظالم کے حوالہ کر دیا ۔ جیسا کہ حضرت عائشہ نے جو اس حاکم جماعت کی ایجنٹ اور ترجمان تھیں کہا کہ " یہی وہ فتنہ ہے جس نے ملع دھرمی ہوا و ہوس کا وہ میدان قائم کر دیا جس میں مختلف جماعتیں اور متعدد سیاستیں پیدا ہوئیں — مسلمانوں میں افتراق اور اجتماع اسلامی میں ایسا انقسام پیدا ہو گیا کہ جس سے اس کا اسلامی وقار ہمیشہ کے لیے ان سے رخصت ہو گیا " (ملاحظہ ہو دور شورئ ج ۲ ص ۱۹)

آپ کیا خیال کرتے ہیں اس امت کے بارے میں جس نے جو تھائی صدی

میں اسلام کی عظیم ترین حکومت قائم کردی صرف اس خاموشی کے تصدق میں جو علیؑ نے اختیار کی۔ جس نے حکومت کی بنیادوں کو مستحکم کردیا۔ اور حکام کو آگے بڑھنے کا موقع دیا۔

اقول: آپ ایسی امت کا کیا وقار اور ان کی دنیا میں کیا عظمت سمجھتے ہیں۔ یہ رائے اس وقت قائم کیجیے جب آپ کے دل میں ان سلاطین کی محبت نہ ہو جن کا کام ضرر رسانی امت، جن کا مشغلہ شراب و کباب، اور جن کی زندگی جنگ و جدل تھی جنھوں نے تاریخ اسلام کے چہرے کو اپنے کردار سے بدنما بنادیا اور اُمّت کے پورے وقار کو کھو دیا۔

افسوس کہ صدیق و فاروق نے صرف اپنے زمانے کا مطالعہ کیا اور یہ سمجھے کہ میری خلافت شخصیت اسلامی کی حمایت کرے گی۔ کاش وہ مستقبل پر بھی ایک نظر ڈالتے تو انھیں وہی خطرات نظر آتے جنھیں فاطمہؑ زہرا چشم معرفت سے دیکھ رہی تھیں۔ اور جن سے فاطمہؑ اُمّتِ اسلامیہ کو آگاہ کر رہی تھیں۔

۵۔ مقدمہ فدک

اللہ کا حکم ہے کہ امانتوں کو ان کے اہل تک پہنچادو
اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو انصاف سے
اللہ بہترین واعظ ہے۔
وہ تمھارے عمل کا نگراں ہے۔

خلیفہ اپنی ردّ میں

مسئلہ اوّل: اگر ہم اپنی بحث کو ایک حد تک دقیق بنانا چاہتے ہیں تو ہمیں علمی بحث کے قوانین پر دو باتوں کو پرکھنا پڑے گا۔ میراث فاطمہؑ کے مقابلہ میں موقف خلیفہ۔ جس میں انھوں نے اپنی اس حدیث پر اعتماد کیا تھا جو انھوں نے اس موضوع میں مختلف اسلوب اور متعدد اشکال کے ساتھ پیش کی۔ زمانہ حاضر میں وہ روایت نقل کی جاتی ہے۔ لیکن مختلف عبارتوں کے ساتھ اور متعدد شکلوں میں۔ یا اسلیے کہ خلیفہ نے مختلف موقعوں کی مناسبت سے الفاظ میں تبدیلی پیدا کردی تھی۔ یا اسلیے کہ روایت ہی پیغمبرؐ اسلام سے متعدد الفاظ میں وارد ہوئی ہے۔ اس مسئلہ میں چند امور قابلِ غور ہیں۔

(۱) یہ دیکھنا ہے کہ جس حدیث سے خلیفہ نے بنت رسولؐ کو ترکہ نبوت سے محروم کر دیا اس پر خود انہیں کتنا اعتماد تھا۔ روایت یہ بتاتی ہے کہ ابوبکر نے صدیقہؑ کو فدک دے دیا تھا لیکن درمیان میں عمرؓ آگیا اور کہا کہ مسلمان کیا کھائیں گے اور یہ کہہ کر قبالۂ فدک کو پارہ پارہ کر دیا۔[1] ہم اس روایت کو ایک حد تک مان لیتے ہیں۔ اس لیے کہ اگر اس میں کچھ قوت نہ ہوتی تو اس وقت کے حالات اسے ہرگز نہ بیان ہونے دیتے۔ اور اگر یہ حدیث صحیح ہے تو ظاہر ہے کہ تسلیم فدک خطبہ فاطمہؑ کے بعد اور حدیث نفی وراثت کے بعد کی ہے۔ اس لیے کہ مرتدین کی جنگ کہ جس کے لیے عمر کو سرمایہ کی ضرورت تھی سقیفہ کے دس دن[2] بعد سے شروع ہوئی اور اسی طرح خطبہ فاطمہ زہراؑ بھی سقیفہ کے دسویں دن کا واقعہ ہے۔

(۲) خلیفہ نے وقت وفات، فاطمہؑ کو فدک نہ دینے پر ندامت کا اظہار کیا[3] تھا۔ بلکہ ایک وقت تو اس قدر متاثر ہو گئے تھے کہ خلافت سے استعفیٰ دے رہے تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خلیفہ کے دل میں ایک عجیب اضطراب تھا جس کا سبب یہ احساس تھا کہ ہم نے فاطمہؑ کے فیصلے میں غلطی سے کام لیا ہے اور جس مدرک پر اعتماد کیا ہے وہ بالکل بے بنیاد ہے۔ یہ بات ان کے

ع۱ سیرۃ حلبیہ ج ۳ ص ۳۹۱

ع۲ مروج الذہب ج ۲ ص ۱۹۳

ع۳ سمو المعنی فی سمو الذات شیخ عبداللہ العلائلی ص ۱۸

دل میں اکثر ہیجان پیدا کرتی تھی جس سے سکون کا ذریعہ انہیں نہ ملتا تھا۔ یہاں تک کہ پیمانہ صبر لبریز ہو گیا اور وقت آخر انہیں اضطراب و قلق کا اظہار ندامت کی شکل میں کرنا پڑا۔

(۳) یہ ایک ناقابل فراموش حقیقت ہے کہ ابوبکر نے جوار رسولؐ میں دفن ہونے کی وصیت کی تھی اور یہ بات ہرگز صحیح نہیں ہو سکتی جب تک کہ اپنی روایات کے اعتبار سے دست بردار نہ ہو جائیں، جس کو انھوں نے قانونی مدرک قرار دیا تھا، اور اپنی دختر سے اجازت نہ لے لیں کہ جس کے حصہ میراث میں دفن ہونا چاہتے ہیں (اگر زمین کی میراث زوجہ کو ملتی ہو اور عائشہ کا حصہ اس قدر طویل کے لیے کافی ہو) اگر ان کی رائے بھی باقی رہی کہ ترکہ نبیؐ صدقہ مسلمین ہے تو انہیں تمام مسلمانوں سے اجازت لینے کی ضرورت تھی اور اگر یہ فرض بھی کرلیا جائے کہ انھوں نے بالغین سے اجازت لے لی ہو گی تو سوال یہ ہے کہ غیر بالغین اور قاصرین کے حقوق ان کے لیے کس نے مباح کر دیے۔

ہماری بحث اور موقف خلیفہ

(۴) ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ خلیفہ نے ازواج نبیؐ سے ان کے وہ مکانات نہیں سلب کیے جن میں وہ حیات نبی اکرمؐ میں سکونت پذیر تھیں۔ کوئی بتلائے کہ آخر یہ تفریق کیوں؟ فاطمہؑ کا مال تو لیکر مصالح مسلمین میں صرف کیا جائے اور ازواج کو ان کے اموال میں مطلق العنان قرار دیا جائے۔ یہاں تک کہ عائشہؓ سے دفن کی اجازت لی جائے؟ کیا حکم عدم وراثت فقط بضعۃ النبیؐ سے

مخصوص تھا ؟ یا ازواج کے مکانات انھیں بطور عطیہ ملے تھے ؟ اگر ایسا ہے تو اس پر خلیفہ کے پاس کیا دلیل تھی ؟ حالاں کہ نہ کسی نے دعویٰ کیا اور نہ بینہ قائم کیا اور ظاہر ہے کہ حیات رسولؐ کا قبضہ دلیل ملک نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کہ وہ قبضہ قبضہ پیغمبرؐ کی وجہ سے تھا جیسے کہ زوج و زوجہ کی شان ہوتی ہے اسی طرح قرآن میں مکانوں کی نسبت ازواج کی طرف دلیل ملکیت نہیں ہے۔ اس لئے کہ نسبت کے لیے معمولی مناسبت بھی کافی ہے جیسا کہ قرآن نے چند آیات کے بعد انھیں مکانات کو رسولؐ کی طرف منسوب کر دیا ہے۔ اگر ترتیب قرآنی حجت ہے تو یہ آیت بھی دلیل ہے۔ اس کے علاوہ صحاح اہلسنت میں بیت کی نسبت پیغمبرؐ کی طرف بکثرت ملتی ہے: "میرے بیت و منبر کے درمیان باغ جنت ہے"۔

(۵) ہم یہ پوچھتے ہیں کہ حکم عدم میراث وحی الٰہی ہے تو اسے پیغمبرؐ نے کیوں نہیں بیان کیا ؟ اور یہ صرف بضعۃ النبیؐ پر کیوں جاری کیا گیا۔ باقی انبیاء پر یہ حکم کیوں نہیں لگایا ؟ یا یہ کہ انبیاء نے اس حکم کو صرف اس لیے نہیں بیان کیا کہ مالِ دنیا اُن کی اولاد میں محفوظ رہے ؟ یا یہ کہ انبیاء نے اس پر عمل کیا لیکن تاریخ نے اس کا ذکر نہیں کیا ؟ یا یہ کہ یہ حکم سیاست وقت کی تازہ پیداوار ہے ؟

(۶) کیا یہ ممکن ہے کہ پیغمبرؐ اپنی محبوب ترین بیٹی کو مصائب اور شدائد میں مبتلا کر دے صرف اس لیے کہ اسے حکم سے آگاہ نہ کرے حالاں کہ یہی وہ بیٹی ہے کہ جس کے غضب و مسرت پر پیغمبرؐ اکرم کے رنج و خوشی کی بنیاد ہے۔ کیا یہ پیغمبرؐ کو اچھا معلوم ہوتا تھا کہ ان کی بیٹی بھرے دربار میں رسوا ہو اور اسے مسلمانوں کے مجمع میں ذلیل کیا جائے اور اس کے بعد مسلمانوں میں ایک عظیم اختلافِ دائمی

پیدا ہو جائے حالاں کہ وہ رحمۃ للعالمین تھے۔

روایات خلیفہ اور ہماری تنقید

اگر ہم ان احادیث کو جو اس موضوع میں پیش کی گئی ہیں معنوی اعتبار سے پرکھنا چاہیں تو ہمیں انھیں دو قسموں میں منقسم کر دینا پڑے گا۔

قسم اوّل : بعض احادیث میں ہے کہ ابوبکر نے کلام فاطمہؑ کو سن کر گریہ کیا اور کہا اے بنت رسولؐ تمھارے باپ نے دینار و درہم کو میراث نہیں بنایا اور یہ فرمایا ہے کہ "انبیاء کا کوئی وارث نہیں ہوتا"۔ اور اس کے بعد اپنے خطبہ میں کہا کہ میں نے رسولؐ اللہ کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ ہم گروہ انبیاء سونا چاندی زمین و جائداد کا وارث نہیں بناتے۔ ہماری میراث ایمان و حکمت علم و سنّت ہے

قسم دوم : عبارت معروف اور وہ یہ کہ پیغمبرؐ نے فرمایا ہے کہ "ہم وارث نہیں بناتے جو چھوڑیں وہ صدقہ ہے (یا ہم جس مال کو بطور صدقہ چھوڑتے ہیں اس کا وارث نہیں بناتے)

سب سے اہم بات اس مقام پر یہ معلوم کرنا ہے کہ حدیث کی دلالت عدم وراثت انبیاء پر قطعی ہے کہ قابل شک و شبہ نہ ہو ؟ یا صرف ظاہر علی ہے کہ اس کے دوسرے معنی بھی مراد ہو سکتے ہیں ؟ یا مجمل و مشتبہ ہے کہ کوئی بات واضح طور پر معلوم نہ ہوتی ہو ؟ قسم اوّل کی احادیث کا عنوان بتاتا ہے کہ اس میں دو احتمال ہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مقصود نفی ارث ہو جیسا کہ خلیفہ نے خیال کیا

اور یہ بھی ممکن ہے کہ پیغمبرؐ بتانا چاہتے ہوں کہ مقام نبوت اجل وارفع ہے۔ اس کی شان یہ نہیں ہے کہ مالِ دُنیا اور ثروت مادّی کو جمع کرے شاید رسولؐ اکرم کا اشارہ اس بات کی طرف رہا ہو کہ انبیاء ملائکہ صفت بشر ہیں۔ ان کے یہاں مادی انانیت بشری خواہشات کا گزر نہیں۔ یہ آسمانی مخلوق ہیں ان کو ارضی مادہ سے کوئی علاقہ نہیں، یہ منبع خیر مطلع نور اور مورث ایمان و حکمت، اساس سلطنت الٰہیہ ہیں۔ یہ سرمایہ دار و نفائس دُنیا کے طماع نہیں ہوتے کہ درہم و دینار سونا چاندی، زمین و جائداد مہیا کر کے اپنی میراث بنائیں اس لیے کہ میراث مال جمع کرنے کے بعد ہوگی اور یہ ان امور سے کہیں بلند ہیں۔ ان کی نظر میں مال دنیا بے قیمت اور ثروت مادی بے وقار ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ عدم ارث کا حکم بوجہ عدم مال کیا گیا ہو؟ جیسے کہ ہم کہیں کہ فقراء کا کوئی وارث نہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان کے لیے آسمان سے کوئی خاص حکم اترا ہے۔ بلکہ مقصود یہ ہوگا کہ یہ مال نہیں رکھتے۔ اسی طرح مقصود پیغمبرؐ یہ ہے کہ انبیاء کو مادی دولت و ثروت سے رغبت نہیں ہوتی کہ وہ وارث مال بنائیں (ہاں اگر کوئی مال اپنی ضرورت سے بچ گیا تو اس کا وارث ضرور بنائیں گے) یہ مطلب حدیث اگرچہ ذہن عامہ سے بعید ہے مگر مذاق رسالت سے بہت قریب ہے (اس لیے کہ کلام رسولؐ کو ایسے گہرے معانی اور باریک مطالب پر مشتمل ہونا چاہیئے جسے عامة الناس نہ معلوم کر سکیں)

اگر آپ میرے معنی سے اتفاق کرنا چاہتے ہیں تو پہلے توریث کے معنی معلوم کریں کہ جس کی نفی کی گئی ہے تاکہ مطالب واضح ہو سکیں۔ توریث کے معنی ہیں کسی

شے کا میراث بنانا اور مورث وہ شخص ہے جو مال کے میت سے وارث کی طرف انتقال کا سبب ہو۔ یہ انتقال دو باتوں پر موقوف ہے۔ اوّل وجود ترکہ۔ دوّم قانون کہ جو وارث کو مال سے حصّہ دلائے۔ پہلی بات مرنے والے کی طرف سے ہوگی اور دوسری بات کا تعلق اس شارع سے جس نے قانون ارث کو وضع کیا ہے خواہ وہ کوئی ایسا انسان ہو جسے لوگوں نے حق قانون سازی دیا ہو یا کوئی جماعت ہو۔ یا کوئی نبیؐ ہو جو آسمانی وحی سے احکام وضع کرتا ہے اگرچہ میت اور قانون ساز دونوں کو میراث میں دخل ہے لیکن مورث درحقیقت مرنے والے ہی کو کہیں گے جس نے مادہ ارث کو جمع کر کے میراث کے شرائط مہیا کیے ہیں۔ برخلاف شارع کے کہ اس نے وضع قانون سے کوئی میراث نہیں بنائی بلکہ ایک نظام بنا دیا ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ جب مرنے والا مال چھوڑے گا تو اس کے پسماندگان وارث ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ اس نظام ارث سے مال موجود نہیں ہو سکتا۔ بلکہ ضرورت اس امر کی ہے کہ میت کچھ جمع کر کے چھوڑ گئی ہو۔

واضع قانون کی مثال اس شخص کی ہے جس نے آگ جلانے کے اسباب مہیا کر دیے ہوں۔ اب اگر آپ نے کاغذ ڈال دیا اور وہ جل گیا تو یہ فعل آپ کی طرف منسوب ہوگا اس سے اس امر کا کوئی تعلق نہ ہوگا کہ جس نے آگ روشن کی ہے اس لیے کہ حرارت اپنی آخری علت کی طرف منسوب ہوتی ہے۔

اس قاعدہ کی بنا پر کسی شخص کی طرف نسبت توریث یہ بتاتی ہے کہ میراث میں آخری شرط بھی ہے اور وہ وہی شخص ہوگا جس نے مال ایجاد کیا ہے۔ پس "الانبیاء یورثون" کا مفہوم یہ ہوگا کہ انبیاءؑ مال و دولت جمع

کر کے اسے ترکہ قرار دیتے ہیں۔ اور اس کی نفی کا مطلب یہ ہوگا کہ ان کی شان جمع اموال اور تحصیل ثروت سے بلند و بالا ہے۔ وہ میراث کے لیے سعی نہیں کرتے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ عدم توریث انبیاء کا مفہوم کوئی جدید قانون نہیں ہے صرف ان کے لیے بنایا گیا ہو اس لیے کہ یہ توریث مجازی ہے۔ بلکہ اس کا مطلب عدم جمع اموال ہے جو کہ توریث حقیقی ہے۔

دوسرے الفاظ میں یہ یوں کہا جائے کہ اگر عدم توریث سے مراد توریث قانونی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ جملہ آسمانی شریعتیں باطل ہیں اس لیے کہ قانون تملیک صرف اپنے ورثہ سے نہیں ہوتا بلکہ وہ تمام عوام کے لیے بنایا جاتا ہے اور اگر مراد عدم توریث حقیقی ہے تو مصدیق کا دعویٰ باطل ہو جائے گا اور نتیجہ یہ ہوگا کہ انبیاء مال ہی جمع نہیں کرتے نہ یہ کہ موجودہ مال بھی صدقہ بنا کر چلے جاتے ہیں۔

پہلی روایت میں خلیفہ نے تمہیداً یہ کہا تھا۔ بخدا تمہارے باپ نے درہم و دینار کو میراث نہیں بنایا۔ جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ پیغمبرؐ نے کوئی مال چھوڑا ہی نہیں ہے جسے میراث بنایا جائے۔ اگر خلیفہ اس جملہ سے وہ معنی و مراد لے سکتے ہیں جو اُن کے موافق ہو تو ہم بھی حدیث کا یہی مفہوم قرار دے سکتے ہیں کہ جو ہمارے موافق ہو۔ اگر ہم ان مثالوں کا بھی لحاظ کریں جو دوسری حدیث میں بیان کی گئی ہیں تو ہمارے معنی کی قیمت اور بڑھ جائے گی اسلیے کہ سونا چاندی گھر و جائداد کا تذکرہ مفہوم خلیفہ کے معنی کے ساتھ سازگار نہیں ہے اس لیے کہ اگر مقصد عدم ارث کے قانون کا بیان مقصود ہوتا تو معمولی سے معمولی چیز کا ذکر کیا جاتا تاکہ معلوم ہو کہ انبیاء کسی شئے کا وارث نہیں بناتے۔ مثلاً اگر ہم کہیں کہ اولاد کفار سونا چاندی کے وارث نہیں تو فوراً یہ خیال پیدا ہو جاتا

ہے کہ معمولی چیزوں کے وارث ضرور ہوں گے۔ پس اگر یہ بیان کرنا چاہیں کہ وہ کسی شئے کے وارث نہیں تو کمترین اشیاء کا ذکر کریں گے۔ خلاصہ یہ ہے کہ قانون عدم ارث کی توضیح موقوف ہے اس بات پر کہ ایسی اشیاء کا ذکر کیا جائے جن کو عموماً ترکہ میں حساب بھی نہیں کیا جاتا تاکہ مطلب بخوبی واضح ہو جائے نہ کہ نفیس اور بیش قیمت اشیاء کا جن سے معمولی اشیاء کی میراث ثابت ہوتی ہے۔ ان قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ مراد پیغمبر اسلام بیان زہد انبیاء اور اموالِ مادی اور دنیاوی کو جمع کرنے سے انبیاء اور اولیاء خدا کا عدم اہتمام ہے۔ اسی بیان کے لیے نفیس ترکہ کا ذکر مناسب ہے کہ جن کی جمع آوری زہد انسانی اور مقامات علیا کے منافی ہے۔ قانون عدم ارث کے بیان میں ان کا ذکر کسی طرح مناسب نہیں معلوم ہوتا جیسا کہ واضح کیا گیا۔

(۷) ہمارے بیان کا شاہد اسی حدیث کا وہ جملہ بھی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ انبیاء ایمان و حکمت کا وارث بناتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس فقرے سے مراد نئے قانون کا وضع کرنا نہیں ہے بلکہ مقصود یہ ہے کہ انبیاء ایمان و حکمت کی اس منزل پر ہوتے ہیں جو انھیں اس قابل بنا دیتی ہے کہ اپنے معارف کو نشر کر سکیں۔ اس فقرے سے پہلے فقرہ کا مطلب بھی واضح ہو جاتا ہے کہ وہ مال کو زیادہ جمع ہی نہیں کرتے کہ اس کو منتشر کریں۔ اور اپنے بعد کے لیے اس کا کسی کو وارث بنائیں۔

(۸) اگر یہ کہا جائے کہ کلام رسول اکرمؐ "اولاد کفار وارث نہیں ہوتی" سے ہم وضع قانون سمجھتے ہیں تو اسی طرح اس فقرہ حدیث کا مفہوم بھی ہونا چاہیئے تو اس کا جواب یہ ہے کہ ان دونوں کلاموں میں واضح فرق ہے اور وہ یہ کہ واضع قانون جب اپنے ماتحت افراد کے متعلق کوئی خبر دیتا ہے تو اس سے یہ خیال ہوتا ہے کہ یہ خبر کے ذریعہ کوئی حکم

تا فقد کرنا چاہتا ہے۔ لیکن اگر اپنے سے غیر متعلق افراد کے متعلق کوئی خبر دے تو وہاں یہ تصور لغو ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کلام میں اپنی شریعت کے کافر بچوں کی خبر ہے لہٰذا یہ ایک حکم شرعی بن جائے گا۔ اور اس حدیث میں انبیاء گذشتہ کی خبر ہے اور ان کے لیے کسی قانون کے وضع کرنے کا اب کون سا محل باقی رہ جاتا ہے جبکہ وہ دنیا سے گزر چکے۔

لہٰذا معلوم ہوتا ہے کہ دونوں فقروں کا مفہوم جداگانہ ہے۔

(۹) آپ یہ اعتراض نہ کریں کہ اکثر انبیاء نے مال دنیا جمع کیا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ روایت جھوٹی ہو جائے۔ اسلیے کہ حدیث میں توریث کی نفی کی گئی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ میراث کی نسبت انبیاءؑ کی طرف نہیں ہے کہ انھوں نے مال تلاش کر کر کے جمع کیا ہو تا کہ کسی کو اپنا وارث بنائیں۔

جس طرح سے مہذب اس شخص کو کہیں گے جس نے وسائل تہذیب استعمال کیے ہوں۔ اگر ایک شخص علماء اخلاق کے اقوال کو سن کر یا پڑھ کر اپنے نفس کو آراستہ کرے تو اسے مہذب نہیں کہیں گے اسلیے کہ کسی عمل کی نسبت اس وقت تک حاصل نہیں ہوتی جب تک اس کے لیے زحمت نہ کی جائے۔ انبیاء کرامؑ اگرچہ دار دنیا میں سیم وزر کے مالک تھے لیکن وہ اسلیے کہ انھوں نے اس کے پیچھے گردش کی ہو جیسا کہ عامۃ الناس کا طریقہ ہے۔ اس کے علاوہ ممکن ہے کہ اس کلام کو رسولؐ نے کنایۃً فرمایا ہو جس سے مقصود اس کے لفظی معنی اصلاً نہ ہوں بلکہ مراد زہد انبیاءؑ ہو۔ اس صورت میں مال دنیا کا آن کے پاس ہونا حدیث کی صحت کے لیے قطعاً مضر نہیں ہے جیسا کہ زمانہ قدیم میں کریم انسان کو زیادہ خاکستر والا کہا کرتے تھے۔ اور یہ کلام صحیح تھا اگرچہ کریم ہو خواہ اس کے گھر میں راکھ بھی نہ ہو اس لیے کہ مراد معنی لفظی نہ تھے بلکہ یہ ایک کنایہ تھا۔ اسی

طرح حدیث میں مراد بیان زہد انبیاءؑ ہے خواہ ان کے پاس مال دنیا ہو یا نہ ہو جیسا کہ واضح ہے۔

(۱۰) اگر ہم حدیث کی قسم دوم کا مطلب معلوم کرنا چاہیں تو ہمیں حسب ذیل تین معانی میں فرق کرنا چاہیئے۔

(۱) ترکہ میت میراث نہیں بنتا ــــ اس کا مطلب ہے کہ ہر وہ شے جو وقت وفات تک مرنے والے کی ملکیت تھی اور جسے وہ چھوڑ کر گیا ہے میراث نہیں ہے بلکہ صدقہ ہے۔

(۲) ہر وہ شے جسے میت نے اپنی حیات میں صدقہ کر دیا ہے یا وقف کر دیا ہے وہ میراث نہیں بن سکتی بلکہ صدقہ و وقف ہی رہے گی۔ اور ورثہ غیر صدقہ اموال کے وارث ہوں گے۔

(۳) فلاں شخص کے پاس ترکہ مملوکہ نہیں ہے کہ میراث بنے بلکہ اس کے جملہ متروکہ اموال صدقات و اوقاف کے ہیں۔

جب ہمیں ان عبارات کا فرق معلوم ہو گیا تو یہ بھی ظاہر ہو گیا کہ الفاظ حدیث کا مطلب نہایت مجمل و مشتبہ ہے۔ جو تینوں معانی پر منطبق ہو سکتا ہے اسلیے کہ حدیث کا دوسرا فقرہ " ما ترکناہ صدقۃ " اگر مستقل طور پر مبتدا اور خبر قرار دیا جائے تو اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ " ملک میت میراث نہیں بلکہ صدقہ بن جائے گی " اور یا یہ ہوگا کہ " میت کسی شے کی مالک نہیں ہے بلکہ اس کا جملہ ترکہ صدقہ ہے جو اس نے جمع کر رکھا ہے " اور اگر اس فقرہ کو پہلے فقرہ کا تتمہ قرار دیا جاوے تو اس سے مراد دوسرے معنی ہوں گے۔ یعنی یہ کہ " وہ مال جسے میت نے اپنی زندگی میں تصدق کر دیا ہے وہ میراث نہیں ہے باقی اموال میراث بن سکتے ہیں " اس صورت میں

مَاتَرَکنَاہ مفعول ہوگا مبتدا نہ ہوگا اگر اس فقرہ کو پلٹ کر کہا جائے مَاتَرَکناہ صدقہ لا نورث تو اس کا مفہوم بھی یہی ہوگا جو بیان کیا گیا ہے۔ تو جس طرح عکس کلام کا مطلب یہ ہے کہ صدقہ میراث نہیں اسی طرح اصل کلام کا بھی مطلب یہی ہوگا۔ یہ مطلب نہیں ہو سکتا کہ (میراث صدقہ بن جاتی ہے) لہٰذا اب یہ حدیث صدقہ کے میراث ہونے کی نفی کرے گی نہ کہ انبیاءؑ کے لیے قانون عدم وراثت کی بنیاد ہوگی۔

اب ہم سیبویہ جیسے افراد کا لحاظ کرتے ہوئے اعراب بھی بیان کیے دیتے ہیں۔ پہلی صورت میں صدقہ مضموم و مرفوع ہوگا۔ اسلیے کہ خبر ہے اور دوسری صورت میں منصوب و مفتوح ہوگا۔ چونکہ تمیز ہے اور یہ فرق ہمارے مطلب کے لیے مضر نہیں ہے اسلیے کہ وقت تکلم اکثر اعراب ظاہر نہیں ہوتا۔ بالخصوص کلمات کے آخر میں۔

(۱۱) جب ہم نے معنی روایت کے مختلف احتمالات آپ کے سامنے پیش کر دیے تو اب اگر ہم اس امر کا دعویٰ کریں کہ روایت صراحتاً مطلوب خلیفہ پر دلالت نہیں کرتی تو ہرگز بے جا نہ ہوگا۔ بلکہ میرا دعویٰ تو یہ ہے کہ میرے معنی (صدقہ میراث نہیں بنتا) خلیفہ کے معنی (میراث صدقہ بن جاتی ہے) سے کہیں زیادہ بہتر ہیں۔ اسلیے کہ حدیث میں ضمیر جمع ہے اور جمع کا استعمال فرد واحد میں مجاز ہے جو اگرچہ مقام تعظیم میں استعمال ہوتا ہے لیکن یہ بات شان انکسار پیغمبرؐ اسلام سے بہت زیادہ بعید ہے۔ بنا بریں ظاہر لفظ کا تقاضہ یہ ہے کہ لفظ کو جماعت کے لیے استعمال کیا جائے اور تنہا پیغمبرؐ کے لیے مخصوص نہ کیا جائے۔ اور اصول تکلم یہ بتاتے ہیں کہ اس جماعت سے مراد جماعت مسلمین ہے نہ کہ جماعت انبیاءؑ اس لیے کہ یہ حدیث ذکر انبیاءؑ سے خالی ہے اور اس سے قبل بھی ان کا

کچھ ذکر نہ تھا۔ اگر آپ یہ احتمال دیں کہ شاید وقت تکلم رسول اکرمؐ کوئی قرینہ رہا ہو جو اس امر پر دلالت کر رہا ہو کہ مراد جماعت انبیاءؑ ہے تو یہ خیانت خلیفہ کے مترادف ہوگا۔ اسلیے کہ راوی حدیث کا فریضہ ہے کہ روایت کو مع جملہ قرائن کے بیان کرے۔ اور جب انھوں نے بیان نہیں کیا ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس قسم کا کوئی قرینہ وقت تکلم بھی نہ تھا۔ مزید بر آں یہ کہ ایسے قرینہ کا حذف کر دینا مطلوب خلیفہ کے بھی خلاف تھا۔ لہٰذا اگر کوئی ایسی شے ہوتی تو وہ ضرور بیان کرتے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ روایت بعینہٖ انہیں حدود کے ساتھ بلا زیادتی و نقصان صادر ہوئی تھی۔

میں نے جماعت مسلمین کو اس لیے مقصود قرار دیا ہے کہ یہی رسم دنیا ہے کہ جب کوئی شخص مجمع میں گفتگو کرتا ہے اور جمع کے الفاظ استعمال کرتا ہے تو اس سے مراد وہی جماعت ہوتی ہے جو بنگاہوں کے سامنے موجود ہو۔ مثلاً کوئی عالم ایک اجتماع احباب میں بیٹھ کر کوئی بات کہے اور وہ جماعت سے متعلق ہو تو ظاہر ہے کہ اس سے مراد وہی احباب کی جماعت ہوگی جو نگاہوں کے سامنے موجود ہو نہ کہ علماء کی جماعت۔ بلکہ اگر اس کے مقصود علماء ہوں اور بیان نہ کرے تو یہ معمہ ہو کر رہ جائے گا۔ جب یہ واضح ہو گیا کہ حدیث سے مراد جملہ مسلمان ہیں تو اب کیا اس حدیث کا مفہوم یہ ہوگا کہ مسلمان میت کا کوئی وارث نہیں ہوتا؟ یا یہ کہ مسلمان جو کچھ چھوڑ کر مرے سب صدقہ ہے ترکہ نہیں؟ حاشا و کلا! یہ تو ضروریات دین اسلام کے خلاف ہے اس لیے کہ مسلمان بنص قرآن مختلف اسباب سے اموال کا مالک ہوتا ہے اور بعد مرگ اس کے ورثہ اس کے مال کے وارث ہوتے ہیں۔

ہاں اگر یہ مفہوم لیا جائے کہ صدقہ میراث میں داخل نہیں تو اس میں کوئی خرابی

نہیں۔ یہ ایک عام اسلامی اصول ہے جو جملہ صدقات مسلمین میں رائج ہے۔ یہ بھی کوئی عجیب بات نہیں کہ صدقہ کے میراث نہ ہونے کا حکم (عدم توریث صدقہ) جو کہ اس قدر واضح ہے اسے صدر اسلام میں بیان کیا جائے' اسلیے کہ احکام اسلامی تمام کے تمام صدر اسلام میں اس قدر واضح نہ تھے کہ محتاج بیان نہ ہوں۔ اس وقت یہ احتمال بہت قوی تھا کہ صدقات واوقاف بعد مرگ ختم ہو جائیں اور اموال میراث بن جائیں۔

میرے اس معنی کی رد اس بات سے نہیں ہو سکتی کہ اسے فاطمہؑ زہرا نے خلیفہ کے سامنے نہیں بیان کیا اس لیے کہ اسکی چند وجوہ ہیں،

(۱) وہ سخت موقع جس میں فاطمہ زہراؑ نے قیام کیا تھا اس میں اتنی گنجائش نہ تھی کہ ایسے دقیق اعتراضات کئے جائیں۔ اس لیے کہ حکومت وقت کا مطلب یہ تھا کہ جلد سے جلد صورت حال پر قابو حاصل کرے۔ یہی وجہ ہے کہ جب شہزادیؑ نے آیات قرآنیہ کو استدلال میں پیش کیا تو خلیفہ نے سوائے ہاں ہاں کے کوئی جواب نہ دیا (ملاحظہ ہو طبقات ابن سعد) ظاہر ہے کہ ایسے حالات میں ان اعتراضات کا جواب صرف یہ ہوتا کہ ہم نہیں مانتے لہٰذا ان کا بیان کرنا لغو تھا۔

(۲) ان اعتراضات کو فاطمہؑ زہرا کے مقصد سے کوئی لگاؤ بھی نہ تھا اسلیے کہ آپ کا مقصد حکومت وقت کا ابطال تھا۔ اور اس کے لیے ایسے طریقے اختیار کرنے ضروری تھے کہ جو عام فہم ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے اپنے خطبہ میں لوگوں کی عقلوں کو مخاطب کیا لیکن جو باتیں پیش کیں وہ سب بدیہیات اور واضحات میں سے تھیں تاکہ لوگ ایسی خلافت سے نفرت کریں جو ایسے بے بنیاد اصول پر مبنی ہو۔

چنانچہ پہلے فاطمہؑ زہرا نے یہ واضح کیا کہ خلیفہ کے فیصلے کی کوئی قرآنی سند نہیں ہے (اس لیے کہ قرآن میں توارث مسلمین کی آیات موجود ہیں ۱؎) اور اس کے بعد وہ آیات پیش کیں جن میں توارث سلیمانؑ کا ذکر ہے۔ اور پھر ان آیات کا ذکر کیا جن میں میراث انبیاءؑ کا ذکر ہے۔ اس کے بعد رنگ استدلال کو یوں بدل دیا کہ اگر حکم خلیفہ حق ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ نبیؐ و وصیؑ سے زیادہ عالم ہے۔ اس لیے کہ انھوں نے اس قسم کی کوئی بات نہیں کی۔ یہ بات واضح ہے کہ ترکۂ نبیؐ کا علم ابوبکر کو نبیؐ و علیؑ سے زیادہ کسی صورت سے بھی نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا یہ معلوم ہوا کہ یہ فیصلہ غلط ہے۔

"یا ابن ابی قحافہ! تو اپنے باپ کا وارث ہے اور میں اپنے باپ کی وارث نہیں؟ یہ تو بہت بڑا بہتان ہے! کیا تو نے عمداً کتاب خدا کو پس پشت ڈال دیا ہے؟ وہ تو کہتا ہے کہ سلیمانؑ وارث داؤدؑ تھے۔ اس میں تو ہے کہ زکریاؑ نے یحییٰؑ کے وراثت کی دعا کی لہٰذا اس کا قانون ہے کہ صاحبان قرابت وارث ہوتے ہیں۔ کیا تیرے لیے کوئی خاص آیت ہے جس سے میرے باپ کو الگ رکھا گیا ہے؟ کیا تیرا خیال ہے کہ مختلف المذہب آپس میں وارث نہیں ہوتے تو کیا میرا اور میرے

۱؎ آج کل یہ بات واضحات میں سے ہو چکی ہے کہ خبر واحد معتبر عمومات قرآن کو تخصیص دے سکتی ہے۔ اسلیے ایسی خبر اصالۃ العموم یا اصالۃ الاطلاق پر حاکم یا وارد ہوا کرتی ہے۔ کما ہو الصحیح اس کے باوجود فاطمہؑ زہرا کا عمومات سے استدلال کرنا یہ بتاتا ہے کہ آپ ابوبکر کو معتبر نہ سمجھتی تھیں۔

باپ کا مذہب ایک نہیں ہے؟ کیا تو عموم و خصوص قرآن کو میرے باپ اور ابن عم سے بہتر سمجھ لیتا ہے"؟

فاطمہؑ کے اقدام میں سب سے زیادہ نمایاں پہلو جذباتی تھا۔ اور عجب نہیں کہ فاطمہؑ نے ساری کوشش اسی بات پر صرف کر دی ہو کہ لوگوں کے قلوب و جذبات کو اپنی طرف موڑ لیں۔ اس لیے کہ قلب ہی حاکم نفس اور تمہید روح انقلاب ہے۔

فاطمہؑ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئیں اور انھوں نے اپنے بیان کو ایسا رنگ دے دیا کہ احساسات بیدار ہو گئے۔ جذبات تڑپ اٹھے۔ دل بے قابو ہو گئے اور ظاہر ہے کہ عورت کے لیے اس سے بہتر اسلحہ اور کیا ہو سکتا ہے اگر وہ ایسے وقت میں قیام کرنا چاہے جس طرح فاطمہؑ نے کیا۔

اگر ہم بیان فاطمہؑ کا علمی جمال دیکھنا چاہیں تو ہمیں اس خطبہ کی طرف متوجہ ہونا پڑے گا جو شہزادیؑ نے مجمع انصار میں فرمایا تھا۔ فرماتی ہیں: اے گروہ باقی ماندہ مسلمین! اے انصار ملت! اے مربیان اسلام! آخر یہ میری نصرت میں کوتاہی اور میری مدد میں سستی کیوں ہے؟ تم نے میرے حق پر چشم پوشی کیوں کی؟ اور میرے ظلم پر سو کیوں گئے؟ کیا رسولؐ نے نہیں فرمایا تھا کہ انسان کا تحفظ اس کی اولاد سے ہوتا ہے! بہت جلدی تم نے باتیں بدل دیں اور نئی نئی باتیں ایجاد کیں! ابھی رسولؐ کا انتقال ہوا ہے اور تم نے دین کو بھی زندہ درگور کر دیا! حق یہ ہے کہ انتقال رسولؐ ایک حادثۂ عظیم ہے جس سے دین اور ضعیف ہو گیا۔ اس کے شگاف گم ہو گئے کوئی انھیں پُر کرنے والا بھی نہیں ہے! زمین تاریک ہے پہاڑ مضطرب ہیں اور امیدیں پامال ہو گئیں۔ حریم رسالت کو ضائع اور برباد کیا گیا۔

ان کی ہتک حرمت کی گئی۔ یہی مصیبت ہے جس کا قرآن نے اعلان کیا کہ "اگر پیغمبر مر جائے یا قتل ہو جائے تو کہیں ایسا نہ ہو کہ تم دین سے پھر جاؤ اور جو دین سے پلٹ گیا اس سے اللہ کا نقصان نہیں ہے"۔

"کیوں اے انصار! تمھارے سامنے میری میراث ہڑپ کر لی گئی۔ تم تک خبر پہنچی تم نے آواز سنی۔ تمھارے پاس آدمی بھی تھے اور اسلحے بھی۔ تمھیں اللہ نے منتخب کیا تھا۔ تمھیں اس نے چنا تھا لیکن اس کے باوجود تم نے سانس بھی نہ لی"۔

ان بیانات سے ثابت ہو گیا کہ معنی حدیث میں مناقشہ کرنا حکومت وقت کو بے اثر نہیں بنا سکتا تھا۔ اور اس کو اس مقصد سے کوئی علاقہ نہ تھا جسے فاطمہؑ لے کر اٹھی تھیں۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ آپ نے عطیہ کا بھی تذکرہ اس خطبہ میں نہیں فرمایا۔

خلیفہ کیا چاہتا ہے؟

جب ہم خلیفہ کے روایات کی وضاحت کر چکے اور یہ ثابت کر چکے کہ ان روایات کی دلالت ان کے مقصد پر واضح نہیں ہے تو اب ضرورت اس بات کی ہے کہ حضرت زہراؑ کے مقابلہ میں ابوبکر کے موقف کی توضیح کرتے ہوئے مسئلہ فدک میں ان کی صحیح رائے معلوم کریں۔ اگرچہ ایک تحقیق کرنے والے کے لیے یہ موقع انتہائی دشوار گزار ہے۔ اس لیے کہ باوجود کثرت مدارک تاریخیہ مسئلہ ایک محیر العقول حیثیت رکھتا ہے۔ اس لیے کہ اس مسئلہ میں کوئی مرکز نزاع معین ہوتا نظر نہیں آتا۔

لوگوں کا خیال ہے کہ مرکز نزاع مسئلہ وراثت انبیاء ہے۔ اس سلسلہ میں صدیقہؑ مدعی ہیں اور ابوبکر منکر۔ لیکن میرا عقیدہ یہ ہے کہ اس نقطہ پر مسئلہ پوری طرح

حل ہوتا نظر نہیں آتا۔ اور اس طرح پر حسب ذیل امور کا کوئی معقول رشتہ دکھائی نہیں دیتا۔

(۱) دوران گفتگو میں خلیفہ نے صدیقہ طاہرہ سے کہا" یہ مال پیغمبرؐ کا نہیں تھا بلکہ مسلمانوں کا مال تھا جس کو پیغمبرؐ بحیثیت امیر صرف کیا کرتے تھے۔ جب ان کا انتقال ہوگیا تو اب اس کا اختیار میرے ہاتھ میں ہے"۔ اس کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ محل بحث علاوہ وراثت انبیاءؑ کے کوئی اور شے ہے۔

(۲) دوسری گفتگو کے دوران میں خلیفہ نے کہا "اے فاطمہؑ تمھارے باپ مجھ سے اور تم میری اولاد سے بہتر ہو لیکن رسولؐ نے فرمایا ہے کہ ہم اپنے ترکہ کا وارث نہیں بناتے یعنی ان اموال مطلوبہ کا" اس کلام میں آخری جملہ قابل توجہ ہے۔ اس لیے کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ صرف پیغمبر اکرمؐ کی میراث کے لیے ہے نہ کہ جملہ انبیاءؑ کی۔ اور نہ اس کا کوئی تعلق مسلمانوں سے ہے۔ اس اعتبار سے معلوم ہوتا ہے کہ خلیفہ کے نزدیک مفہوم حدیث عدم وراثت صدقات نہیں ہے اس لیے کہ یہ جملہ مسلمین کے لیے قانون عام ہے جس کو رسولوںؑ سے کوئی خصوصیت حاصل نہیں ہے۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ خلیفہ کے نزدیک مفہوم حدیث بھی نہیں تھا کہ اموالِ رسولِ اکرمؐ میراث نہیں ہوتے بلکہ صدقہ ہو جاتے ہیں اسلیے کہ اگر ایسا ہوتا تو عبارت حدیث کچھ اور ہوتی۔ اس کا تعلق صرف ان اموال سے نہ ہوتا جن کا فاطمہؑ مطالبہ کر رہی تھیں۔ حالاں کہ ظاہر حدیث یہ ہے کہ یہ روایت صرف اموال خاصہ فاطمہؑ زہرا کے بارے میں پیش کی گئی ہے۔ لہٰذا اب اگر عدم توریث انبیاء، کوئی قانونی بات ہے تو اسے جملہ اموال متروکہ میں جاری ہونا چاہیے۔ صرف اموالِ فاطمہؑ سے اس کا تعلق خلافِ

انصاف ہے۔

اس کی مثال یوں ہی ہے کہ اگر کوئی شخص حکم دے کہ آج رات تمام آنے والوں کا احترام کرو اور اتفاقاً اس رات میں دو آدمی آجائیں تو ظاہر ہے کہ متکلم کی مراد صرف یہ دو آدمی نہیں تھے بلکہ ایک قاعدہ تھا جو ان پر منطبق ہوگیا۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جائے کہ ترکہ نبیؐ کی تفسیر ان اموال خاصہ سے بتاتی ہے کہ خلیفہ کے نزدیک یہ حکم انھیں اموال سے مخصوص ہے۔ حالاں کہ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ قانون صرف چند چیزوں سے مخصوص نہیں ہوتا بلکہ جملہ افراد پر حاوی ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ ہم یہ پوچھتے ہیں کہ اس آخری جملہ کا فائدہ کیا ہے اور خلیفہ کا اس سے مقصود کیا ہے؟ اگر حکم عدم توریث عام ہے تو کیا خلیفہ کو ان اموال پر ترکہ کے صدق میں کوئی شک تھا؟ اگر یہ فرض کر لیا جائے تو اس میں خلیفہ کا فائدہ ضرور ہے اس لیے کہ جب ترکہ ہونے میں شک ہوگا تو ورثہ کی طرف منتقل بھی نہ ہوگا۔ ہم یہ تسلیم نہیں کر سکتے کہ اس جملہ سے خلیفہ شک رفع کرنا چاہتے ہیں۔ اور فاطمہؑ زہرا کو باقی اعتراضات سے روکنا چاہتے ہیں۔ اس لیے کہ فاطمہؑ کا مطالبہ خود اس بات کی دلیل ہے کہ وہ مال کو ترکہ میں داخل سمجھتی ہیں ورنہ میراث کیوں بنتا۔ ہم یہ فرض کر لیتے ہیں کہ اموال فاطمہؑ بھی ترکہ کا ایک جزو ہیں اور مراد پیغمبرؐ تمام ترکہ نہیں ہے بلکہ شاید ان کا مقصود فدک جیسی جائداد ہو۔ تو کیا ہم بھی یہ فرض کر لیں کہ خلیفہ کی غرض اس جملہ سے حکم کا فاطمہؑ کے اموال سے مخصوص کرنا ہے۔ یہ تو غیر ممکن ہے اسلیے کہ اموال پیغمبرؐ مختلف الحکم ہوں، بعض میراث ہوں اور بعض نہ ہوں یہ بڑی

عجیب و غریب بات ہے۔

ان تاویلات سے جو بات واضح ہوتی ہے وہ یہ کہ خلیفہ کی نظر میں مفہوم حدیث یہ تھا کہ ہم ان اموال کے مالک ہی نہیں ہیں کہ ان کا کوئی وارث ہو اور اسی لیے آپ نے اسے ترکہ فرمایا ہے جیسے کوئی شخص اپنی اولاد کو جمع کر کے کہے کہ میرا تمام ترکہ صدقہ ہے تو اس کا مقصد یہ ہوگا کہ یہ میری ملکیت نہیں کہ یہ لوگ میرے بعد اس کے وارث ہوں۔

(۳) فاطمہؑ کے نمائندہ کو ابوبکر کا جواب جب اس نے آکر فدک اور خمس خیبر وغیرہ کا مطالبہ کیا تو انھوں نے حدیث سنائی "ہمارے مال کا کوئی وارث نہیں" صرف آل محمدؐ اس میں کھا سکتے ہیں۔ میں صدقات رسولؐ میں ذرہ برابر تغیر نہیں دے سکتا۔

اس کلام میں اگر ہم یہ فرض کرلیں کہ خلیفہ کی رائے میں مفہوم حدیث عدم توریث املاک انبیاؑ ہے تو ان کے کلام میں تناقض پیدا ہوجائے گا اس لیے کہ حدیث سے استدلال یہ بتاتا ہے کہ وہ مطالبات زہراؑ کو اموال نبیؐ میں جانتے ہیں۔ لیکن اس کی میراث کے قائل نہیں ہیں۔ اور جملہ آخر اس کے بالکل برعکس ہے۔ اس لیے کہ جس مال میں فاطمہؑ زہرا وراثت پیغمبرؐ کو بقول ابوبکر بدلنا چاہتی تھیں وہ فدک و خمس خیبر وغیرہ ہیں۔ جن کو انھوں نے اموال میں شمار کیا ہے اور اب صدقات نبیؐ سے تعبیر کر رہے ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ اموال نہیں ہیں بلکہ صدقات ہیں اور یہ واضح تضاد ہے۔

خلیفہ سے تصفیہ حساب

بعض روایات مسلّمہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ابوبکر جملہ انبیاءؑ کی توریث کے قائل نہ تھے۔ اس لیے کہ جن روایات نے خطبہ زہراؑ کو نقل کیا ہے اور یہ بیان کیا ہے کہ ابوبکر نے "انا معشر الانبیاء" سے استدلال کیا ہے اس میں یہ ہے کہ فاطمہؑ نے آیات عامہ و خاصہ میراث سے اعتراض کیا لیکن ابوبکر عدم توریث نبیؐ پر اڑے رہے اور روایات کو برابر بیان کرتے رہے۔ فاطمہؑ بھی اسی شدت سے انکار کرتی رہیں۔

اب خلیفہ کی دو حدیثیں ہوگئیں ۱۔ صدقات میراث نہیں بنتے:
۲۔ انبیاءؑ کا کوئی وارث نہیں ہوتا۔
اور اس سے ان کے دو دعوے بنے ۱۔ فدک صدقہ ہے پس میراث نہیں ۲۔ املاک نبیؐ میراث نہیں بنتے۔

پہلی حدیث میں آخری جملہ کا اضافہ کر کے فدک کو صدقہ بنایا اور دوسری حدیث سے اس کا میراث ہونا ختم کردیا۔

(۱) ان بیانات کے بعد اگر ہم خلیفہ سے تصفیہ حساب کرنا چاہیں تو اس میں ذرا بھی دقت نہ ہوگی اس لیے کہ موقف بالکل واضح ہوگیا ہے اور حدیث کے احتمالات سامنے آچکے ہیں۔ ہمارے اب تک کے اعتراضات کا خلاصہ حسب ذیل امور میں واضح ہوجاتا ہے۔

۱۔ خلیفہ نے اکثر اوقات میں خود اپنی حدیث کی مخالفت کی جیسا کہ ابتدائے بحث میں

بیان کیا گیا۔

۲۔ یہ احتمال بے جا ہے کہ رسولؐ نے اپنی دختر سے حدیث کو مخفی رکھا اور اسے ابوبکرؓ سے بیان کر دیا۔[1] حالاں کہ ابوبکرؓ عادۃً رسولؐ کے ساتھ تنہا نہ رہتے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ رسولؐ نے عمداً تنہائی میں بلا کر انھیں حدیث بتادی اور فاطمہؑ سے چھپالیا تاکہ یہ بھرے دربار میں تجل و شرمندہ ہوں۔ (نعوذ باللہ)

۳۔ علیؑ بلاشک وریب وصی رسولؐ اکرم ہیں جیسا کہ حدیث متواتر میں وارد ہوا ہے جو روایت سے گزر کر شعراء کے دواوین تک پہنچ گئی اور جس کو حسب ذیل حضرات نے نظم بھی کر دیا۔ عبداللہ ابن عباس، خزیمہ بن ثابت، حجر بن عدی، ابی ہیثم بن تیہان، عبداللہ بن ابوسفیان بن حرث بن عبدالمطلب، حسان بن ثابت، امیرالمومنین علیؑ ابن ابی طالبؑ۔[2] پس وصایت وہ منصب اسلامی ہے کہ جو علیؑ کی ذات کے ساتھ بلاشک و شبہ مخصوص ہے۔[3]

اگرچہ اس وصایت میں شیعہ وسنّی میں اختلاف ہے۔ شیعہ کا خیال ہے کہ وصایت بمعنی نص رسولؐ ہے اور سنّی کا خیال ہے کہ وصایت بمعنی وراثت علم و شریعت

۱۔ یہاں تک کہ عائشہ بیان کرتی ہیں کہ جب بعد وفات رسول اکرمؐ میراث میں اختلاف ہوا تو کسی کے پاس کوئی علم نہ تھا آخر کار ابا جان نے یہ روایات بیان کردی کہ انبیاء لاوارث ہوتے ہیں۔ ملاحظہ ہو صواعق محرقہ ابن حجر۔

۲۔ شرح نہج البلاغہ ج ۱ ص ۴۹۔۴۰ ج ۳ ص ۱۵

۳۔ شرح نہج البلاغہ ج ۱ ص ۴۶

وغیرہ ہے۔ میں اس وقت اس بحث کو نہیں چھیڑنا چاہتا۔ صرف جس قدر میرے موضوع سے متعلق ہے اسی قدر بیان کرنا چاہتا ہوں۔ اگر ہم یہ فرض کریں کہ وصایت بمعنی خلافت ہے تو پھر کہنا پڑے گا کہ صدیق نے اسلامی اقدار میں بہترین اشیاء کی پہیری کی اور امور امت میں بلاوجہ شرعی تصرف کیا اور ایسے شخص کو حکومت کا کوئی حق نہیں ہے اور نہ اس کی کوئی حدیث معتبر ہے۔ اور اگر یہ مان لیں کہ وصایت بمعنی وراثت علم و شریعت ہے تو کیا ممکن ہے کہ اس وصایت کو مانتے ہوئے اس حدیث کو بھی مان لیں جس کا وصی انکار کرے۔ حالاں کہ شریعت سماویہ کے لئے بیدار چشم بھی ایک انسان ہے جس کی رائے ہر ایک مسئلہ میں بلاتردد قبول کرنی چاہیے۔ یہ امین رسولؐ ہے اور اعلم شریعت پیغمبرؐ ہے۔ اگر یہ احتمال دیں کہ وصایت سے مراد وراثت خصوصیات رسالت ہے تو پھر اس کا کیا مطلب ہے کہ وارثِ رسولؐ کے ہوتے ہوئے ترکہ رسولؐ کو غیروں کے ہاتھوں میں دیکھیں۔

۴۔ ترکہ نبوت پر بلاوجہ شرعی کے قابض ہو جانا یہ خلیفہ کے اولیات میں سے ہے۔ اس کے قبل تاریخ میں اس قسم کا کوئی تذکرہ نہیں ہے۔ حالاں کہ اگر یہ قاعدہ وراثت انبیاءؑ کے متعلق ہوتا تو ہر خلیفہ کا کردار اس کے نبیؐ کے متروکات کے متعلق ایسا ہی ہوتا جس طرح کہ خلیفہ کا۔ ملکیت فدک سے انکار کر دینا جیسا کہ بعض کلمات سے ظاہر ہوا انتہائی جلد بازی پر دلیل ہے۔ اس لیے کہ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ فدک بلا کسی حرب و ضرب کے حاصل ہوا ہے اور ہر وہ خطہ جو بغیر جنگ حاصل ہو خاص پیغمبرؐ کی ملکیت ہوتا ہے جیسا کہ آیات قرآنی سے معلوم ہوتا ہے[1] اس قسم کی کوئی بھی

۱۔ سیرۃ ابن ہشام ج ۲ ص ۴۲۹ تاریخ کامل ج ۲ ص ۸۵ شرح نہج البلاغہ ج ۴ ص ۷۸

حدیث نہیں ہے کہ پیغمبرؐ نے اسے تصدق یا وقف کر دیا ہو۔

۵؎ وہ دونوں حدیثیں جو خلیفہ نے اس موضوع میں پیش کی ہیں قطعاً ان کے مطلوب کے لیے وافی نہیں ہیں بلکہ ان کے معانی کچھ اور ہیں جن کی وضاحت کی گئی۔ اگر کوئی شخص ہمارے معنی کو معین طور پر تسلیم نہ کرے تو کم از کم اتنا تو ضرور مانے گا کہ تمام معانی برابر ہیں اور اس صورت میں کلام مجمل ہو جاتا ہے اور یہ قاعدہ ہے کہ مجمل کلام سے استدلال انتہائی مہمل ہوتا ہے۔

ان اعتراضات کے بعد ہم ایک اعتراض اور کر سکتے ہیں۔ اس فرض پر جب ہم خلیفہ کے بیان کردہ معانی کو تسلیم کر لیں اور کہیں کہ "انا معشر الانبیاء لا نورث" سے مراد قانون عدم وراثت ہے نہ کہ نفی جمیع اموال۔ اور "ماترکناہ صدقہ" سے مراد حیلہ مستقل ہے کہ ہمارے متروکات صدقہ بن جاتے ہیں نہ یہ کہ صدقات میراث نہیں بنتے۔ ان تمام باتوں کے باوجود ہم یہ کہیں گے کہ اس روایت کی تاویل انتہائی ضروری ہے۔ اور اس کے ظاہر پر اعتماد اصطلاح علمی کے لحاظ سے ناجائز ہے اور وہ اس لیے کہ روایت کا مطلب عدم توریث جمیع انبیاءؑ ہو گا جیسا کہ بعض احادیث میں صراحتاً بیان ہوا ہے اور "لا نورث" میں صیغۂ جمع بھی اسی بات پر دال ہے اس لیے کہ حکم جماعت کے لیے ہے اور ظاہر ہے کہ ایسی کوئی جماعت عامۃ المسلمین میں نہیں ہے کہ جس کے خصوصیات میں عدم توریث بھی داخل ہو۔ حالانکہ عدم توریث جمیع انبیاءؑ صریح قرآن کے مخالف ہے جس میں مختلف انبیاءؑ مثل زکریاؑ و سلیمانؑ وغیرہ کی وراثت کا تذکرہ ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اس وراثت سے مراد وراثت مال ہے اس لیے کہ وہی قابل نقل و انتقال ہے۔ علم و شریعت حقیقتاً قابل انتقال نہیں

ہیں۱؎۔ (اس لیے کہ علم بنا بر قول بہ اتحاد عاقل و معقول غیر ممکن الانتقال ہے۔ بلاشک و ریب) اور اسی طرح اگر ہم عاقل و معقول میں وجود کے اعتبار سے مغایرت بھی تسلیم کر لیں جب بھی اتنا تو ضرور کہیں گے کہ صور علمیہ مجرد ہوتی ہیں اور وہ نفس انسانی کے ساتھ قائم ہیں یعنی معلول نفس ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ ہر معلول بحیثیت ذات اپنی علت سے وابستہ ہوتا ہے۔ لہٰذا اس کا ایک علت کو چھوڑ کر دوسری کی طرف منتقل ہو جانا نہایت ہی غیر معقول ہے۔ اور اگر ہم اس امر کے قائل ہو جائیں کہ صورت علمیہ معلول نفس نہیں ہے بلکہ نفس انسانی میں حلول کئے ہوئے ہے اور اس کی علت کوئی اور شے ہے جب بھی یہ واضح امر ہے کہ ایک حلول کرنے والی شے کبھی اپنا محل تبدیل نہیں کر سکتی۔ جیسا کہ فلسفہ میں ثابت ہو چکا ہے۔ اس صورت میں خواہ ہم صورت علمیہ کو مجرد مانیں یا مادی کوئی فرق نہ ہو گا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تحقیق فلسفی کے اعتبار سے علم کسی صورت سے قابل نقل و انتقال نہیں ہے۔)

(اسی طرح نبوت بھی عقلی اعتبار سے قابل نقل و انتقال نہیں ہے۔ خواہ ہم نبوت کی وہ تفسیر کریں کہ جو بعض فلاسفہ نے کی ہے۔ یعنی نبوت ایک مرتبہ کمالِ نفس ہے اور فضل انسانی کا ایک آخری درجہ ہے جہاں ارتقائے انسانیت اور کمالِ بشریت کی حد بندی ہو جاتی ہے۔ یا وہ معنی بیان کریں کہ جو اذہان عامہ میں ہیں یعنی یہ کہ نبوت ایک منصب الٰہی ہے جس کو وہ جسے عطا کرتا ہے۔ کمال نفس شرائط نبوت میں سے ہے عین نبوت نہیں۔ واضح ہے کہ پہلے معنی کے اعتبار سے نبوت قابل نقل نہیں ہے

۱؎ قوسین کے درمیان کی عبارت اگر ترک بھی کر دی جائے تو مطالعہ میں کوئی خلل واقع نہ ہو گا۔ مترجم

اسلیے کہ نبوت نفس وجود نبیؑ اور عین کمال ذاتی پیغمبر ہے۔ اسی طرح دوسرے معنی کے لحاظ سے اسلیے کہ اس بنا پر نبوت ایک اعتبار ربانی ہے جو کسی خاص شخص سے قائم ہوتا ہے اس کا انتقال بغیر تبدیلی شخص ناممکن ہے۔ اور تبدیلی شخص ایک نئے اعتبار کو ملتزم ہے جو کہ نبوت جدیدہ ہو جائے گی۔ مثلاً نبوت زکریاؑ۔ یہ مختصات نفس زکریاؑ میں سے ہے وہ کسی طرف منتقل ہو جائے ناممکن ہے اگر اللہ کسی اور کو بھی نبی فرض کرلے گا تو یہ جدیدہ نبوت ہو گی نہ کہ نبوت منتقلہ۔ یہ امر تو بادی النظر میں واضح ہو جاتا ہے کہ نبوت اور علم قابل انتقال نہیں ہیں۔ یہ کوئی ایسی عمیق و دقیق بات نہیں ہے کہ خلیفہ کی سمجھ میں نہ آسکے۔ اور جب یہ معلوم ہو گیا کہ یہ چیزیں قابل توریث و انتقال نہیں ہیں تو مراد وراثت مال ہے) اور اس حالت میں آیت؛ روایت خلیفہ سے معارض ہو جائے گی۔ لہٰذا کم از کم روایت کی تاویل ذکر نا پڑے گی۔

۳. جناب زکریاؑ کے قصہ میں وراثت مال پر ایک اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ اس صورت میں دعائے نبیؑ غیر مستجاب ہو جاتی ہے اس لیے کہ جناب یحییٰؑ وارث مال نہیں ہوئے۔ چونکہ زکریاؑ کی زندگی میں شہید ہو گئے البتہ وارث نبوت ضرور ہوئے اس لیے یرثنی ہوئے۔ لیکن اس کا حل یہ ہے کہ اعتراض ہر حال میں باقی ہے۔ اگر وراثت نبوت کے قائل ہوں تو جب بھی دعا غیر مستجاب ہوگی اسلیے کہ دعا اس وراثت کے لیے ہے جو بعد زکریاؑ حاصل ہو اور یہ نبوت یحییٰؑ حیات زکریاؑ میں تھی۔ لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ آیت کی ایسی توضیح کی جائے جس سے یہ اعتراض بالکل ختم ہو جائے اور وہ یہ کہ جملہ "یرثنی و یرث من آل یعقوب" کو دعائے

مقدر کا جواب قرار دیا جائے اور مطلوب زکریاؑ صرف فرزند ہو جس کا مطلب یہ ہوگا کہ مجھے فرزند دے۔ اگر فرزند ہوگا تو وہ وارث بھی ہو گا۔ اس جملہ کو ولی کی صفت نہ قرار دیا جائے کہ جس کا مطلب یہ ہے کہ خدایا ایسا فرزند دے جو وارث بھی ہو۔ بنا بریں مسئلہ وراثت دعائے زکریاؑ سے جداگانہ ہے۔ یہ صرف زکریاؑ کا اعتقاد ہے کہ اگر لڑکا ہوگا تو وہ وارث بھی ہوگا۔

اعراب کے اعتبار سے دونوں معانی میں فرق ہوگا۔ اگر جملہ کو صفت قرار دیا جائے تو وہ مرفوع ہوگا یَرِثُنی۔ اور اگر جواب دعائے مقدر قرار دیا جائے تو مجزوم ہوگا یَرِثْنی، چنانچہ اس لفظ کی قرأت میں دونوں وجہیں نقل کی گئی ہیں۔

اگر قرآن میں دوسرے مقام پر ہم دعائے زکریاؑ کو دیکھتے ہیں تو وہاں دعا صرف ذریت طیبہ سے متعلق نظر آتی ہے: "ھب لی من لدنك ذریة طیبة"

فہم قرآن کا سب سے بڑا ذریعہ خود قرآن مجید ہے۔ بنا بریں آیات سے اندازہ ہوتا ہے کہ زکریاؑ کا مطلوب صرف ذریت طیبہ ہے البتہ کبھی اسی کو ایک جملہ میں بیان کر دیا ہے جیسا کہ اس آیت میں ہے۔ اور کبھی دو جملوں میں جیسا کہ آیت مبحوث عنہا میں ہے۔ پہلے ولی کی دعا ہے پھر تمنا ہے کہ وہ پسندیدہ بھی ہو۔ بہر حال دونوں مقامات کو ملانے کے بعد یہ حاصل ہوتا ہے کہ وراثت کا مسئلہ حدود دعا سے خارج ہے لہٰذا اس کو دعائے مقدر کا جواب ماننا پڑے گا۔

۴۔ اب یہ امر واضح ہو گیا کہ کلمہ ارث کا استعمال بالکل صحیح ہوا ہے اور مراد آیت وراثت مال ہے نہ کہ ارث نبوت۔ اس لیے کہ حقیقتاً وراثت مال ہی وہ شے

ہے کہ جو جواب واقع ہو سکتی ہے۔ اس لیے کہ جواب دعا وہ شے ہوا کرتی ہے کہ جس کو اصل دعا سے دائمی یا کم از کم اکثری ارتباط ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ نبوت ایسی شے نہیں ہے۔ دنیا میں لاکھوں اولاد پیدا ہوتی ہے لیکن نبی کوئی نہیں ہوتا اس لیے کہ یہ کمال عظیم اور جمال فرید کی طالب ہے ایسی نبوت کو سوال ذریت طیبہ کا جواب نہیں قرار دیا جا سکتا اس لیے کہ ذریت انسانی اور قابل تحمل گرانی نبوت میں نسبت ایک اور لاکھ کی ہے۔ برخلاف وراثت مال کے کہ وہ جواب دعا بن سکتی ہے۔ اس لیے کہ لڑکا جب باپ کے بعد باقی رہتا ہے تو اکثر وارث بھی ہوتا ہے۔ اب چونکہ یہ ایک اکثری امر ہے لہذا اس کا اعتقاد زکریاؑ کو بھی ہو سکتا ہے اس کے علاوہ یہ کہ خود حضرت زکریاؑ بھی نبوت کو لازمہ ذریت نہیں جانتے تھے اور یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اولاد کی دعا کے بعد یہ دعا بھی کی کہ بار الٰہا اس اولاد کو نیک اور پسندیدہ بھی قرار دے۔ ظاہر ہے کہ نبوت کے بعد اس دعا کا کوئی محل باقی نہیں رہتا۔

اگر ہم کلمۂ یرثنی کو صفت ولی بھی قرار دیں جب بھی ہمارا خیال ہے کہ نتیجہ وہی رہے گا اور مراد وراثت مال ہی ہوگی۔ اس سلسلے میں دو باتیں ہماری موید ہوں گی۔

۱ اگر جناب زکریاؑ کا مطلب وہ ولی ہوتا جو وارث نبوت بھی ہو تو وہ دعائے پسندیدگی نہ فرماتے اس لیے کہ نبوت پسندیدگی سے کہیں عظیم منزل ہے۔

۲ سورہ آل عمران میں جناب زکریاؑ کے قصہ میں ارث کا مطلق ذکر نہ ہونا یہ بتاتا ہے کہ اگر میراث حدود دعا سے خارج نہیں تو کم از کم میراث سے مراد ارث مال ضرور ہے۔ اس لیے کہ اگر زکریاؑ کی دعائیں دو ہوتیں، ایک پسندیدہ ولی اور دوسرے وراثت نبوت، تو قرآن مجید آل عمران میں صرف ایک دعا پر اکتفا کرتا۔ اگر اس کی وضاحت درکار ہے

تو یوں تصور فرمائیں کہ اگر کوئی سائل آپ سے ایک باغ اور ایک درہم طلب کرے اور آپ دونوں اسے دے دیں۔ اور جب قصہ کو نقل کریں اور اپنے فضل و کرم کا اظہار کریں تو کیا ممکن ہے کہ ایک درہم کا ذکر کریں اور باغ کا ذکر چھوڑ دیں۔ حاشا وکلّا۔ ہمیشہ بڑی شے کا ذکر کیا جاتا ہے۔ جب عام انعامات و احسانات کا یہ قانون ہے تو عطائے نبوت جو باغ دنیوی سے لاکھوں درجہ اہم ہے کیا ممکن ہے کہ ذریت کے مقابلے میں اس کا ذکر ترک کر دیا جائے ان وجوہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مراد وراثت مال ہے اس لیے کہ یہ ذریت طیبہ سے پست ہے۔ اب اگر اس کا تذکرہ کسی مقام پر بھی ہو تو کوئی حرج نہیں ہے۔

۶۔ بعض علماء نے آیت میں میراث نبوت مراد لینے کی دو وجہیں تحریر فرمائی ہیں۔

۱ : جناب زکریاؑ نے اپنی وراثت کے ساتھ آل یعقوبؑ کی وراثت کا بھی ذکر کیا ہے اور ظاہر ہے کہ حضرت یحییٰؑ تمام اموال آل یعقوبؑ کے وارث نہیں تھے۔ البتہ نبوت و حکمت کے وارث ضرور تھے۔

۲ جناب زکریاؑ نے بطور تمہید کہا تھا "خدایا! مجھے اپنے بعد کے لیے اپنے بنی اعمام سے خطرہ ہے۔ اور ظاہر ہے نبیؑ کو خطرہ احکام دین اور آثار شرع متین کے بارے میں ہوگا جس کی بقا مطلوب رسالت ہے۔ نہ کہ اموال دنیوی کا جو مقام نبوت سے کہیں زیادہ پست ہے۔

ہمارے علماء نے پہلی دلیل کا جواب یہ دیا ہے کہ جناب زکریاؑ نے تمام آل یعقوبؑ کی وراثت کی دعا نہیں کی بلکہ بعض کی۔ جیسا کہ آیت میں مذکور ہے "ویرث من آل یعقوب" اور یہ دعا قبول بھی ہو گئی لہذا اعتراض لغو ہے۔ رہ گئی دوسری دلیل تو وہ

ہمارے مطلوب کی شاہد ہے اس لیے کہ نبوت کے بارے میں خطرہ کا کوئی سوال ہی نہیں ہے۔ جبکہ یہ طے شدہ امر ہے کہ لطف خداوندی انسان کو مہمل و بیکار بلا کسی حجت و دلیل نہیں چھوڑ سکتا۔ بنابرایں آثار دینی اور کلمہ سماویہ عنایت آلہیہ اور رعایت ربانیہ کی وجہ سے محفوظ ہے۔ نبوت چند خاص کامل و نابغہ انسانوں کو ملے گی اس کے لٹنے اور برباد ہونے کا کوئی سوال ہی نہیں ہے۔ پھر اب دعائے زکریاؑ کا مطلب ہے کیا انھوں نے یہ احتمال دیا تھا کہ اللہ ابناء عم میں سے ان لوگوں کو منصب دیدیا گیا کہ جو واجبات رسالت اور فرائض نبوت کو نہ ادا کر سکیں۔ یا یہ خیال تھا کہ میری دعا بغیر اللہ بندوں کو بلا حجت و دلیل چھوڑ دے گا۔ ظاہر ہے کہ یہ باتیں شانِ نبوت سے بعید ہیں۔ بنابرایں مراد خوف اموال ہے۔ اس لیے انھوں نے "ولد رضی طیب" کا مطالبہ کیا تھا اور اس دعا میں نبیؑ کے لیے کوئی نقص نہیں ہے۔ اس لیے ممکن ہے ان کا مطلوب یہ رہا ہو کہ یہ مال اچھی اولاد کو ملے تاکہ مصرف اچھا ہو ورنہ اگر ابناء عم کو مل گیا تو وہ لہو و لعب فتنہ و فساد میں صرف کر دیں گے جیسا کہ آثار سے انھوں نے اندازہ کر لیا تھا یہاں تک کہ مشہور ہے کہ ابناء عم زکریاؑ اشرار بنی اسرائیل تھے۔

ابن ابی الحدید معتزلی نے کوشش کی ہے کہ جناب زکریاؑ کے خوف کو آثار دین سے متعلق قرار دیں اور اس پر دو قسم کی دلیلیں قائم کی ہیں۔

۱۔ یہ دعویٰ کرنا کہ آثار دین کا خوف کرنا نبیؑ کے لیے ناجائز ہے۔ اصول شیعہ کی بنا پر قطعی غلط ہے۔ اس لیے کہ یہ لوگ قائل ہیں کہ ہم غیبت امامؑ کی بنا پر اکثر الطاف آلہیہ سے محروم ہو گئے ہیں جیسے نماز عید و جمعہ وغیرہ اور اس کا مظلمہ ہماری ہی گردن

پر ہے۔ اس لیے کہ ہماری بدکرداریاں ہی اس کا سبب ہوئی ہیں۔ تو کیا ایسی قوم سے جائز نہیں کہ وہ جناب زکریاؑ کے لیے بھی یہ تصور کرے کہ وہ تبدیلی دین اور بربادی احکام شریعت سے خائف رہے ہوں گے۔ اس لیے کہ اللہ پر بعث رسولؐ واجب ہے اگر لوگ خود فساد برپا نہ کریں ورنہ پھر باب لطف مسدود ہو جائے گا۔ حاصل کلام یہ ہے کہ فساد بنی اعمام سے سد باب لطف کا احتمال تھا اس لیے جناب زکریاؑ کو بھی خوف پیدا ہوا۔

ہمارا اعتراض اس کلام پر صرف یہ ہے کہ اس مقام پر ابن ابی الحدید نے دو مطالب کو خلط کر دیا ہے۔ ایک وہ موقع ہوتا ہے کہ جب تمام لوگ نا اہل ہو جائیں اس طرح کہ لطف الٰہی کا استحقاق ختم ہو جائے جیسا کہ زمانہ غیبت امامؑ میں ہے اس صورت میں خوف خدا پیدا ہو سکتا ہے لیکن ایک موقع وہ ہوتا ہے کہ جب انسان یہ جانتا ہے کہ ایک جماعت غضب الٰہی کی مستحق نہیں ہے۔ لیکن لوگ مستحق لطف ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں بعث رسولؐ خداوند عالم پہ واجب ہے۔ لہٰذا اب خوف کا کوئی محل نہیں رہتا۔ بنابرایں ابناء عم کا نا اہل ہونا اس امر کا باعث نہیں ہو سکتا کہ زکریاؑ کو انقطاع سلسلہ نبوت کا خوف پیدا ہو جائے۔ جبکہ لوگ الطاف آلہیہ کے مستحق ہوں۔ اور اگر لوگ مستحق لطف نہ ہوں تو ممکن ہے کہ زمین و آسمان کے اتصالی سلسلے قطع ہو جائیں خواہ اولاد و ابناء عم صالح ہوں یا فاسد۔ ذریت طیب ہے یا غیر طیب۔ آیت صراحتاً دلالت کرتی ہے کہ زکریاؑ کا خوف ابناء عم کی خرابی سے تھا نہ کہ لوگوں کی نا اہلی سے۔ بنابرایں خوف انقطاع نبوت بے محل ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ خوف بربادی اموال

سے متعلق تھا۔

۲۱۔ ہم موالی کے معنی امراء و رؤسا کے قرار دیں گے اور مقصد یہ ہوگا کہ جناب زکریاؑ خائف تھے کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ امراء و رؤسا مسلط ہو کر دین کو فاسد کر دیں۔ اسی لیے دعا کی کہ اللہ ایک نبی بنا دے تاکہ دین محفوظ رہ سکے۔

ہم سوال کریں گے کہ یہ رؤسا کہ جن سے دین میں خطرہ تھا یہ انبیاء تھے کہ غیر انبیاء۔ ظاہر ہے کہ انبیاء سے دین کے لیے کوئی خطرہ نہیں ہو سکتا اس لیے کہ وہ معصوم ہوتے ہیں۔ البتہ ملوک ذیلہ سے کبھی کبھی دین کو خطرہ ہوتا ہے۔ لیکن اس وقت ہمیں یہ دیکھنا پڑے گا کہ وجود نبی آیا ان کے شر و فساد اور ترمیم دستور الٰہی کو روک سکتا ہے یا نہیں۔ اگر وجود نبی ان کے دفاع کے لیے کافی ہے تو زکریاؑ کو خوف کا کیا محل ہے جبکہ وہ جانتے ہیں کہ الطاف الٰہیہ بعث نبی کے قیامت تک کے لیے ضامن ہیں اور یہ اتصال زمین و آسمان تا بقائے دنیا باقی رہے گا۔ اور اگر وجود نبی دفاع اشرار کے لیے غیر وافی ہے تو زکریاؑ کی دعا بے سود ہے۔ اس لیے کہ اولاد کا وجود بھی ان کے خوف کو زائل نہیں کر سکتا حالانکہ ظاہر آیت یہ ہے کہ ولی مرضی کے ملنے کے بعد ان کا خوف دور ہو جائے گا۔ اس قرینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مراد قرآن ارث مال ہے نہ کہ ترکہ نبوت۔ اور جب یہ ثابت ہو گیا کہ انبیاء میں سلسلہ توارث ہے تو اب خلیفہ کی حدیث قرآن سے معارض ہو گئی اور ہر وہ شے جو قرآن سے معارض ہو وہ ساقط اور باطل ہے۔

ہم یہ نہیں کر سکتے کہ تمام انبیاء میں سے زکریاؑ کو مستثنیٰ کر دیں اس لیے کہ حدیث خلیفہ قابل تخصیص نہیں ہے۔ لہٰذا اگر نبوت عدم توارث کی

مقتضی ہے تو ہر نبی کی شان یہی ہونی چاہیئے۔ نبوت زکریاؑ میں کوئی ایسی خصوصیت نہیں ہے کہ وہاں توارث ہو اور باقی کے یہاں نہ ہو۔ آخر زکریاؑ کا کیا قصور ہے کہ ان کا مال امت کو نہ ملے اولاد لے جائیں؟ یا ان کا امتیاز ہے کہ ان کا مال تو اولاد کو ملے اور باقی کا مال لوگ لوٹ کھائیں۔ اس کے علاوہ حدیث خلیفہ میں لفظ انبیاء میں کوئی تخصیص کی ضرورت بھی نہیں ہے جب کہ ہم نے اس کے مناسب معنی بیان کر دیے جو کہ قرآن سے قطعاً معارض نہیں اب ہمیں کیا ضرورت ہے کہ ایسے معنی قرار دیں جس کی وجہ سے زکریاؑ کو فہرست انبیاء سے خارج کرنا پڑے اسطرح کیوں نہ کہیں کہ انبیاء کی شان جمع مال و طمع ثروت سے اجل ہے اس لیے ان کے یہاں اکثر توارث مال نہیں ہوتا۔

اب واضح ہو گیا کہ خلیفہ کے مفہوم کی بنا پر روایت آیت سے بالکل معارض ہے لہٰذا اسے ترک کرنا واجب ہوگا۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ جب صدیقہ طاہرہؑ نے آیت مذکورہ سے خلیفہ پر اعتراض کیا تو انھیں کوئی جواب نہ بن پڑا اور نہ آج تک ان کے ماننے والوں نے اس کا کوئی جواب دیا۔ جس کی واحد وجہ یہ ہے کہ وہ لوگ جانتے ہیں کہ آیت سے روایت کا تعارض ہو رہا ہے۔ اور روایت کسی صورت سے قابلِ عمل نہیں ہو سکتی۔

ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ علی القاعدہ جب دو دلیلوں میں تعارض ہو تو ایک کو مقدم کر سکتے ہیں۔ اور خلیفہ نے حدیث کو مقدم کر دیا۔ اس لیے کہ معارض قرآن باطل و خرافات ہے اسے دلیل نہیں کہتے اور قرآن۔ حق و صدق۔ اس کا کوئی معارض نہیں ہو سکتا۔

خلیفہ کی جرح دوسرے مرکز پر

(مقام ثانی) موقف خلیفہ در موضوع علیہ ـــ صدیقہ طاہرہؑ مدعی ہیں کہ رسولؐ نے انھیں فدک عطا کردیا تھا۔ اور اس کے شاہد ام ایمنؑ، علی ابن ابی طالبؑ اور حسنینؑ ہیں۔ خلیفہ نے دعوےٰ کو قبول نہیں کیا اور بیّنہ کاملہ یعنی دو مرد یا ایک مرد اور دو عورت کا مطالبہ کیا۔

۱۔ سب سے پہلا مواخذہ صدیق سے یہ ہوگا کہ وہ اس مسئلہ میں حاکم کیونکر بن گئے حالاں کہ کم از کم اس وقت تک ان کی حکومت شرعی نہ تھی۔ ہم فی الحال اس مواخذہ کو ترک کیے دیتے ہیں اس لیے کہ یہ موضوع انتہائی وسیع ہے۔ جس کے نتیجہ میں اسلامی سیاست کا سنگ بنیاد ہی اکھڑ جائے گا۔ اور اس کام کے لیے حساب طویل درکار ہے۔

۲۔ دوسرا مواخذہ یہ ہے کہ جب فدک فاطمہؑ کے قبضہ میں تھا تو اب انھیں بیّنہ پیش کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اس مقام پر دو بحثیں ہیں۔

۱۔ فدک کس کے قبضہ میں تھا؟ کیا فدک واقعاً فاطمہؑ کے ہاتھ میں تھا؟

اس مطلب کا بہترین ثبوت امیر المومنینؑ کا وہ خط ہے جو آپ نے عثمان بن حنیف کے نام تحریر فرمایا تھا۔ "ہاں فدک ہمارے ہاتھ میں تھا۔ اس کے بعد ایک قوم نے اس کی طمع کی اور دوسری نے اُن کو دے دیا"۔ اس کلمہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ فدک اہلبیتؑ کے ہاتھ میں تھا جیسا کہ روایات شیعہ میں بھی ہے۔ آپ کا یہ

فرمانا کہ "ہمارے ہاتھ میں فدک تھا" اس سے واضح ہوتا ہے کہ مراد علیؑ و فاطمہؑ کا ہاتھ ہے نہ کہ دست پیغمبرؐ۔ اس اعتبار سے کہ وہ دست اہلبیتؑ ہے۔ اس لیے کہ پیغمبرؐ کے ہاتھ میں غیر فدک اور اموال بھی تھے اور آپ نے فرمایا ہے کہ ہمارے ہاتھ میں فدک تھا۔

۲۔ کیا قبضہ دلیل ملکیت ہے؟ اس کا ثبوت اجماع مسلمین ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو نظام اجتماعی حیات انسانی مختل ہوکر رہ جاتا۔

بعض لوگ اس دعوےٰ پر کہ فدک فاطمہؑ کے قبضہ میں تھا یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اگر ایسا ہوتا تو آپ ذکر کرتیں۔ اور اس وقت نہ دعوےٰ عطیہ کی ضرورت پڑتی اور نہ میراث کی۔ کتب شیعہ میں اس کا جواب موجود ہے کہ اہلبیتؑ نے اس بات سے بھی استدلال کیا ہے۔ لیکن ہم ان کتابوں سے بحث کرنا نہیں چاہتے لیکن یہ بتانا چاہتے ہیں کہ فدک کوئی معمولی زمین یا چھوٹی ملکیت نہیں کہ جس کا قبضہ ادنیٰ توجہ سے معلوم ہوجائے بلکہ یہ ایک وسیع اراضی ہے جس میں فاطمہؑ کا وکیل انتظام کرتا تھا۔ تو اب بتلائیے کہ اس کے قبضہ کا علم غیر وکیل کو کیا ہوسکتا ہے؟

یہ بھی معلوم ہے کہ فدک مدینہ سے قریب بھی نہ تھا کہ اہل مدینہ کو اس کے حالات کا علم ہوجائے۔ اور وہ یہ جان لیں کہ اس کا متولی کون ہے۔ بلکہ مدینہ سے چند دنوں کے راستے پر تھا۔ اور ایک یہودی قریہ تھا کہ جس کو محیط اسلامی سے کوئی تعلق نہ تھا۔ بنابریں قبضہ کا مشہور نہ ہونا کوئی عجیب بات نہیں ہے۔ عجب نہیں کہ صدیقہؑ نے خیال کیا ہو کہ اگر میں نے دعوےٰ قبضہ کیا تو خلیفہ اس پر بھی

بینہ طلب کرے گا ۔ جس طرح کہ عطیہ کے دعویٰ پر طلب کیا ہے ۔ جبکہ خلیفہ کی رفتار صدیقہؑ کی نظر میں ظالمانہ ہے جو کسی حق کے اعتراف پر راضی نہیں ۔

اس زمانہ میں تو یہ بھی آسان تھا کہ وکیل فاطمہؑ کو کوئی مچھلی نگل جاتی جیسے کہ ابوسعید خدری کو نگل گئی اور انھوں نے حدیث عطیہ کو نہیں بیان کیا ۔ اور واقعہ کے چند دنوں بعد اسے ظاہر کردیا ۔ یا کوئی جن قتل کردیتا جس طرح کہ سعد بن عبادہ کو قتل کرکے اس نے فاروق کو نجات دلادی ۔ یا پھر ارتداد سے متہم کردیا جاتا یا یہ کہہ کر کہ صدقہ مسلمین کو روکتا ہے جیسا کہ مانعین زکوٰۃ کو متہم کیا گیا ۔

۲ ہم اس اعتراض کو بھی ترک کئے دیتے ہیں تاکہ ایک بنیادی سلسلہ شروع کریں اور وہ یہ کہ خلیفہ کو عصمت زہراؑ کا اعتقاد اور آیۂ تطہیر جس میں فاطمہؑ شامل ہیں اس پر ایمان تھا یا نہیں ۔ ہم اثبات عصمت کے مسئلے کو طول دینا نہیں چاہتے ۔ اس سے تو کتب امامیہ بھری ہوئی ہیں، جن کا خلیفہ کو بھی علم تھا ۔ اس لیے کہ عائشہ خود بھی آیۂ تطہیر کی راوی ہیں کہ وہ خمسہ نجباء کی شان میں نازل ہوئی اور اس امر کی تصریح صحاح سنت وشیعہ میں ہے کہ رسول اللہؐ نزول آیت کے چھ ماہ تک بعد نماز صبح فاطمہؑ کے دروازہ پر آکر اس آیت کی تلاوت فرماتے تھے ۔

سوال یہ ہے کہ خلیفہ نے بینہ کیوں طلب کیا ، دعویٰ معلوم بھی محتاج بینہ ہے ؟ ابوبکر پر معترضین کا کہنا ہے کہ بینہ حصول گمان غالب کے لیے مقرر کیا گیا ہے اور ظاہر ہے کہ علم ویقین اس سے اقویٰ ہے ۔ بنابریں جب بینہ سے حکم جائز ہے تو علم وقطع سے تو بہرحال جائز ہوگا لیکن میرا خیال ہے کہ یہ اعتراض غیر مناسب ہے اس لیے کہ ان لوگوں نے بینہ اور علم کو نفس حاکم میں تاثیر کے اعتبار سے مقابل

قرار دیا ہے ۔ اس لیے فیصلہ کیا کہ علم اقویٰ ہے حالانکہ اس کا مقابلہ واقع کے اعتبار سے ہونا چاہیئے اور اس لحاظ سے دونوں برابر ہیں علم بھی خطا کرتا ہے اور بینہ بھی ۔

البتہ اس مقام پر ایک نکتہ ہے جس سے اکثر حضرات غافل ہو گئے ہیں اور وہ یہ کہ صداقت زہراؑ کے متعلق خلیفہ کا علم کبھی خطا نہیں ہو سکتا اس لیے کہ وہ ان اسباب سے نہیں حاصل ہوا جس میں اکثر وہم وجہل مرکب ہو جاتا ہے بلکہ اس کا مدرک قرآن کریم ہے جس میں خطا غیر ممکن ہے ۔ اس بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ علم بصداقت زہراؑ خطا نہیں ہو سکتا البتہ بینہ خطا ہو سکتا ہے اور جب کہ برطبق بینہ حکم واجب ہے تو برطبق علم تو بہرحال واجب ہوگا ۔

دوسرے الفاظ میں یوں کہا جائے کہ اگر آیت قرآنی یوں ہوتی کہ فاطمہؑ دعویٰ ملکیت فدک وعطیہ میں صادق ہیں تو کسی مسلمان کو مجال شک اور کسی حاکم اسلامی کے لیے محل تردد باقی نہیں رہ سکتا تھا تو اسی طرح جب قرآن نے عصمت زہراؑ پر نص کردی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ فاطمہؑ کوئی دعویٰ غلط نہ کریں گی ۔ اب جو بھی دعویٰ کریں اس کا قبول کرنا واجب ہوگا ۔ ان دونوں قسموں کی نص میں کوئی فرق واقع نہیں ہے ۔ البتہ عبارتی فرق ضرور ہے ۔

۳ ہم یوں بھی استدلال کر سکتے ہیں کہ آج تک کسی مسلمان نے صدق زہراؑ میں شک نہیں کیا اور نہ کسی نے یہ کہا ہے کہ فاطمہؑ نے اپنے باپ پر افترا کیا ہے صرف نزاع اس بات پر تھی کہ آیا فیصلہ کے لیے علم کافی ہے یا پھر بھی بینہ کی ضرورت ہے ۔ ہم آیۂ تطہیر کو ترک کیے دیتے ہیں لیکن یہ کہتے ہیں کہ جب کہ خلیفہ کو مثل باقی مسلمانوں کے صدق زہراؑ کا علم تھا ، اگرچہ اس میں وہ خصوصیات نہ رہے ہوں

جنھیں ہم نے بیان کیا اور وہ بھی قابل خطا و اشتباہ رہا ہو' اور اس اعتبار سے بیّنہ سے بہتر یا اس کے مساوی نہ رہا ہو۔ لیکن کیا حاکم کو اپنے علم کی بنا پر حکم کرنے سے کوئی شے مانع ہے؟ قرآن مجید کہتا ہے کہ حاکم اپنے علم کی بنا پر حکم کر سکتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے اذا حکمتم بین الناس ان تحکموا بالعدل۔ وممن خلقنا امۃ یھدون بالحق وبہ یعدلون۔ حق و عدل کے دو لحاظ ہوتے ہیں۔ ایک باعتبار واقع و نفس الامر اور ایک بحسب موازین قضاوت۔ اور ظاہر ہے کہ برطبق بیّنہ حکم کرنا اس لحاظ سے عدل و حق ہے۔ خواہ واقع کے اعتبار سے وہ غلط ہی کیوں نہ ہو۔ اب اگر دونوں آیتوں میں حق و عدل سے مراد پہلا لحاظ یعنی لحاظ واقع ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ واقع کی بنا پر حاکم حکم کر سکتا ہے خواہ بیّنہ قائم ہو یا نہ ہو۔ مثلاً اگر حاکم نے معلوم کر لیا ہے کہ فلاں مال فلاں شخص کا ہے تو اس کو یہ حکم کرنے کا قطعاً حق ہے۔ اس لیے کہ واقع اور حقیقت میں اس کا حق ثابت ہے اور یہ حکم بھی اس لحاظ سے حق و عدل ہوگا۔ اور اگر حق و عدل سے مراد آیتوں میں وہ حق و عدل ہے جو بحسب موازین قضاوت ہوتا ہے تو پھر آیتہ سے کسی قسم کا استدلال صحیح نہیں ہوگا۔ اس لیے کہ نہ یہ بتاتی ہے کہ کون سا حکم حق و عدل ہے اور نہ یہ بتاتی ہے کہ کون سا حکم خلاف حق و عدل ہوگا۔ ظاہر ہے کہ آیتوں کا واضح مفہوم اعتبار اول ہے۔ اس لیے کہ جب کسی شے کی کوئی صفت بیان کی جاتی ہے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ شے واقع میں ایسی ہے نہ کہ کسی خاص قاعدہ کی بنا پر۔ پس حکم بحق کا مطلب اس حق کا حکم ہے جو واقعاً ثابت ہو۔ اس پر واضح دلیل تعبیر بعدل بھی ہے کہ جو پہلی آیت میں واقع ہوئی ہے۔

یہ بھی واضح ہے کہ اگر مراد حق و عدل قضاوتی ہوں تو پھر اس کے 'جعل' کرنے کے بعد یہ حکم کہ ان پر عمل کرنا تکرار محض ہوگا۔ اس لیے کہ ایسے قوانین کا وضع کرنا خود ہی حکم بعمل ہے برخلاف حکم عمل بواقع۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ حاکم کو حقیقت واقعہ کے مطابق حکم کرنا چاہیئے۔ خواہ اس پر کوئی دلیل ہو یا نہ ہو اس لیے کہ واقع ہی احکام اسلامیہ کا محور اور مرکز قضاوتہائے دینیہ ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آیات اعتبار علم حاکم پر بخوبی دلالت کرتی ہیں۔ اس کے بعد خلیفہ کو کسی تردد و تامل کا حق نہیں ہے۔ اس کے علاوہ یہ کہ خود صدیق نے فقط دعویٰ پر اعتماد کر کے حکم کیا ہے۔ جیسا کہ بخاری میں ہے کہ بعد وفات پیغمبر اکرمؐ علاء بن حضرمی نے ابوبکر کے پاس کچھ مال بھیجا۔ وہ بولے کہ جس کا نبیؐ پر کوئی قرض ہو یا جس سے انھوں نے کوئی وعدہ کیا ہو وہ آ کر لے لے۔ جابر نے کہا مجھ سے رسولؐ نے حسب ذیل وعدے فرمائے ہیں۔ ابوبکر نے تین مٹھیاں دیں جن میں ہر ایک میں پانچ سو درہم تھے۔

طبقات ابن سعد میں ابوسعید خدری سے روایت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے مدینہ میں ابوبکر کی شادی سنی اس وقت جبکہ مال بحرین آیا' جس کا رسولؐ سے کوئی وعدہ رہا ہو وہ آئے بہت سے لوگ آئے اور لے گئے۔ اتنے میں ابوالبشیر مازنی آ گئے۔ ابوبکر نے کہا اے ابوالبشیر جب کوئی مال آیا کرے تو تم بھی آیا کرو اور یہ کہہ کر ایک ہزار چار سو درہم دیے۔ جب خلیفہ نے کسی صحابی سے قرض یا وعدہ رسولؐ پر بیّنہ (گواہ) نہیں مانگا تو فاطمہؑ سے دعویٰ عطیہ پر بیّنہ کا مطالبہ کیوں کیا؟ کیا نظام قضاوت صرف فاطمہؑ سے مخصوص تھا؟ یا حالات سیاسیہ نے فاطمہؑ کو یہ خصوصیت عطا کر دی تھی؟

عجیب بات ہے کہ صحابی رسولؐ کے دعوے کو مال کثیر میں قبول کر لیا جائے
اور بضعۃ الرسولؐ کا دعویٰ یہ کہہ کر ٹھکرا دیا جائے کہ بیّنہ نہیں موجود ہے! اگر
صداقت مدعی کا علم فیصلہ کو جائز بنا دیتا ہے تو ظاہر ہے کہ جس کی نظر میں جابر و
ابوالبشیر متہم نہیں اس کی نظر میں فاطمہؑ زہرا بھی متہم نہیں ہو سکتیں! اگر صحابہ
کے عطایا دعویٰ کی قبولیت کی بنا پر نہ تھے بلکہ احتمال صدق کی بنا پر احتیاطاً
دیے گئے تھے تو پھر فدک کے معاملہ میں یہ احتیاط کیوں نہیں کی گئی؟ اس طرح
صدیق نے وعدوں کو بلا دلیل و بیّنہ پورا کر دیا اور عطیہ زہراؑ کو رد کر دیا۔ جس میں
وعدہ و عطیہ کا فرق قیامت تک کے لیے تشنہ جواب رہ گیا۔

۵ اب ہم اپنے اعتراض کو ایک نئی بنیاد پر قائم کرتے ہیں اور وہ یہ کہ ہم اس
بات کو تسلیم کیے لیتے ہیں کہ حاکم کو اپنے علم کی بنا پر بغیر بیّنہ کے حکم کرنے کا کوئی حق نہیں
ہے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ صدیق نے خود دعویٰ علیہ کی گواہی کیوں نہ دی؟ جب
کہ انہیں صداقت زہراؑ کا علم تھا۔ اگر وہ اپنی گواہی کو علیؑ کی گواہی کے ساتھ ملا دیتے تو
بیّنہ کامل ہو جاتا اور حق ثابت ہو جاتا۔ یہ بھی واضح رہے کہ اُن کا حاکم بن جانا ان کی
گواہی کو ساقط نہیں کرتا اس لیے کہ اعتبار بیّنہ کی دلیلیں غیر حاکم سے مخصوص نہیں ہیں
بلکہ انہیں ہر ایک کے لیے عمومیت حاصل ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ خلیفہ نے
واقعہ معلوم کو کیوں ترک کیا؟ اس امر کی وضاحت کے لیے ہم دو باتوں کا فرق واضح
کر دینا چاہتے ہیں جن کو اکثر علماء نے غلط کر دیا ہے۔

(۱) مدعی کے قول کے مطابق حکم کرنا (۲) آثار واقع کا نافذ کرنا۔

اگر ہم تسلیم کر لیں کہ پہلا امر بیّنہ پر موقوف ہے تو دوسرا تو بہر حال واجب

اس لیے کہ یہ حکم نہیں ہے کہ اس میں حدود و قیود مقرر کیے جائیں۔ مثلاً اگر کسی کو
معلوم ہو جائے کہ میرا مکان دوسرے کا ہے تو مکان اس کے حوالے کر دینا حکم نہیں کہلاتا
بلکہ اسے قانون و احکام کا اجراء کہا جاتا ہے۔ جس طرح سے اگر کوئی شخص خود حاکم
پر کوئی دعویٰ کرے یا کسی طرح ثابت کر دے کہ تمہارا مکان میرا ہے تو حاکم کو اسے دے
دینا چاہیے۔ اور یہ قضاوت نہیں ہے بلکہ یہ بات بلا حاکم و حکم کے بھی ثابت ہے۔ اس لیے
کہ بیّنہ وغیرہ دلیل قضاوت شرعی نہیں ہیں بلکہ آثار ملکیت واقعی ہیں اور آثار واقعہ
کا بد کرنا ہر مسلمان کا فرض ہے۔ اگر حاکم کسی شخص کے لیے کسی مکان کی ملکیت کا حکم
کرے یا یہ کہ مکان پر آثار ملکیت مرتب کرے تو ان دونوں باتوں کا فرق یہ ہوگا کہ قضاوت
قطع نزاع ہے۔ اگر حاکم نے کوئی فیصلہ کر دیا تو اب تمام مسلمانوں کے لیے اس کا نقض
کرنا حرام ہے۔ اور سب پر اس کے آثار مرتب کرنا واجب ہیں جس کی دلیل صرف
حکم حاکم ہے۔ اور کسی شے کی ضرورت نہیں ہے۔ برخلاف "تطبیق آثار ملکیت کے"
اس لیے کہ یہ قاضی کا شخصی فعل ہے اس کا اتباع لازم نہیں ہے۔ بلکہ ہر شخص
اپنے علم کے مطابق اس شے سے معاملہ کرے گا۔

نتیجہ کلام یہ ہے کہ جب خلیفہ کو فاطمہؑ کی ملکیت کا علم تھا تو انہیں
فدک میں کسی قسم کے تصرف کا حق نہ تھا خواہ حکم کرنا ان کے لیے جائز ہو یا نہ ہو۔
اور اس واقعہ میں ان کے علاوہ کوئی اور منکر بھی نہیں تھا کہ جس سے قسم لے کر اسے
مال دے دیا جائے۔ اس لیے کہ جن اموال کی فاطمہؑ مدعی تھیں یا تو وہ مال اُن کا تھا
یا مسلمانوں کا۔ اور فرض یہ ہے کہ ابوبکر خلیفہ مسلمین تھے لہٰذا یہ ولی مسلمین بھی
تھے۔ اور ان کا فرض تھا کہ ان کے حقوق کا تحفظ کرتے۔ اگر فاطمہؑ اپنے دعویٰ

میں سچی تھیں اور مسلمانوں میں کوئی ان کا مخالف نہ تھا تو اُن سے سلب و غصب کرنا ناجائز تھا۔ بینہ کا نہ ہونا فیصلہ کو حرام بناتا ہے نہ کہ غصب کو جائز و حلال۔

خلاصہ یہ ہوا کہ اپنے علم کی بنا پر حکم نہ کر سکنا خلیفہ کے محاسبہ کو خفیف نہیں بنا سکتا اور انھیں اس امتحان میں کامیاب نہیں بنا سکتا۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین ہ



صدقہ

(۱) جب حد درجہ تنگ دست ہو جاؤ تب اللہ سے صدقے کے ذریعے تجارت کرو۔

(۲) نزول رزق کو صدقے کے ذریعے طلب کرو۔

(۳) صدقہ نجات دینے والی دوا ہے اور دنیا میں بندوں کے اعمال کی آخرت میں آنکھوں کی ٹھنڈک ہوں گے۔

(۴) اپنے ایمان کو صدقہ کے ذریعے محفوظ کر لو۔

(۵) جب انسان مر جاتا ہے تو اس کے تمام اعمال کا سلسلہ ٹوٹ جاتا ہے۔ جز تین اعمال کے: صدقہ جاریہ، وہ علم جس کی وہ لوگوں کو تعلیم دیا کرتا تھا اور لوگوں اس سے استفادہ کیا اور وہ صالح بیٹا جو اس کے لئے دعا کرتا ہو۔

(۶) چار چیزیں جنت کی طرف بلاتی ہیں اپنی مصیبت کو چھپانا پوشیدہ طور سے صدقہ دینا والدین کے ساتھ نیکی اور بکثرت لا الہ الا اللہ کہنا۔

(۷) خفیانہ صدقہ گناہ کو ختم کر دیتا ہے۔

(۸) تین چیزیں انسان کو رضائے خدا تک پہنچا دیتی ہیں: کثرت استغفار، انکساری اور کثرت صدقہ۔

(۹) صدقہ بلاؤں اور سزاؤں کو دفع کر دیتا ہے۔

(۱۰) صدقہ بہترین ذخیروں میں سے ہے۔

(۱۱) رازداری کا صدقہ بہترین نیکیوں میں سے ہے۔

(۱۲) صدقہ برے مقامات سے بچا لیتا ہے۔

(۱۳) صدقہ دولت مندوں کا خزانہ ہے۔

(۱۴) یقیناً برترین نیکی رازداری کا صدقہ اور صلہ رحم کرنا ہے۔

(۱۵) صدقہ کے ذریعے (موت کے معین) وقت کو بڑھایا جاتا ہے۔

(۱۶) دولت کی برکت صدقے میں ہے۔

(۱۷) رازداری کا صدقہ گناہوں کو چھپا دیتا ہے۔

(۱۸) علانیہ صدقہ دینا بری موت کو ٹال دیتا ہے۔

ضیافت

(۱) آپ اپنے ایک صحابی، علاء بن زیاد حارثی کے پاس عیادت کے لئے تشریف لے گئے وہاں جب آپ نے ان کے گھر کی وسعت دیکھی تو فرمایا۔ "تمہیں اس دنیا میں اتنے وسیع گھر کی کیا ضرورت تھی جب کہ تم آخرت میں اس کے زیادہ محتاج رہو گے، البتہ اب اگر تم چاہتے ہو کہ اس گھر کے ذریعے اپنی آخرت پالو تو اس میں مہمان نوازی کرو صلہ رحم اور اس گھر سے حقوق الہی کو ادا کرو اس طرح کرنے کے بعد تم اپنے آپ کو اس کے ذریعے آخرت میں پہنچا ہوا پاؤ گے۔"

(۲) اللہ نے جسے دولت عطا کی ہو اسے اس دولت کے ذریعے رشتہ داروں کی مدد اور بہترین مہمان نوازی کرنا چاہیئے۔

(۳) ایک دن آپ رو رہے تھے آپ سے پوچھا گیا کہ آپ کیونکہ رو رہے ہیں؟ تو آپ نے فرمایا "سات دن سے میرے پاس کوئی مہمان نہیں آیا مجھے خوف ہے کہ خدا کہیں میری اہانت نہ کرے۔"

(۴) جو مومن بھی مہمان کو پسند کرتا ہے وہ اپنی قبر سے اس طرح اٹھے گا کہ اس کا چہرہ چودھویں کے چاند کی طرح (دمکتا) ہوگا لوگ اسے دیکھتے ہی کہیں گے یہ نبی مرسل کے علاوہ اور کوئی ہو ہی نہیں سکتا تب ایک فرشتہ کہے گا "... مومن ہے جو مہمان کو پسند کرتا تھا اور اس کا احترام کرتا تھا لہذا اس کے سے جنت میں داخل ہونے کے سوائے کوئی دوسری راہ نہیں ہے۔"